ستیہ پال آنند کی ”۔۔بُودنی نابُودنی“

حیدر قریشی

Satya Pal Anand ki "......Boodni, Na-Boodni"

By

Haider Qureshi

”نظم کی ابتدا کرتے ہوئے ستیہ پال آنند نے جو یہ فرمایا ہے:

”نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ
ابھی سراپا عمل ہوں، مجھے ہیں کام بہت
ابھی تو میری رگوں میں ہے تیز گام لہو“

اس کے ساتھ اب غالبؔ کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

نظم کی ابتدائی تین سطروں میں غالب کے شعر کی لفظیات کو صرف آگے پیچھے کرنے اور کہیں معنی کو اُلٹا کر دینے کے علاوہ ستیہ پال آنند کا اپنا کیا ہے؟ ستیہ پال آنند کبھی سوچیں کہ غزل پر جو اعتراض وہ کرتے رہے ہیں وہ کیسے پلٹ کر ان کی نظم نگاری کی طرف بار بار آ رہے ہیں۔ میں نے اسے ستیہ پال آنند سے اردو غزل کا انتقام قرار دیا تھا اور بالکل درست لکھا تھا۔“

(اسی کتاب میں شامل مضمون ”دو نظموں کا جائزہ“ سے اقتباس)

''اردو غزل کا انتقام: ستیہ پال آنند کا انجام'' سے اقتباس

غلام محمد قاصر کی غزل کے اشعار اپنے نام سے سنانے کا قصہ

انگریزی میں لکھے گئے ستیہ پال آنند صاحب کے اس وضاحت نامے کے مطابق:

ا۔''ورجینیا کے درگا مندر'' میں یہ کوی سمیلن ہوا تھا۔

۲۔اس میں انہوں نے غلام محمد قاصر کا نام لے کر بتایا تھا کہ یہ اشعار ان کے ہیں۔

۳۔اس ویڈیو کو ٹیمپر کیا گیا ہے اور اس میں جرمنی کا ایک بندہ ملوث ہے۔(روئے سخن غالباً میری طرف ہے)

۴۔میں نے حاضرین کو بتایا تھا کہ میرا بچپن پشاور میں گزرا تھا وہاں میرے درجنوں دوست تھے۔فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، ظہور اعوان اور غلام محمد قاصر، میں نے ان دوستوں کے نام لے کر چند اشعار سنائے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مندر میں ہونے والے کوی سمیلن میں ستیہ پال آنند کو اطمینان تھا کہ یہاں کوئی اردو جاننے والا نہیں ہے۔حاضرین میں دیویوں کی کثرت دیکھ کر دل نے غزل کا سہارا لیا اور انہوں نے ایک معصومانہ انداز میں دوسرے کا کلام اپنے نام سے سنا دیا۔اس میں ایک تسلسل بھی موجود ہے۔''مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا'' کے فوراً بعد انہوں نے اپنا کلام شروع کر دیا ''سانپ سے خوف اب نہیں آتا''۔۔۔۔غزل کی داداسی روانی میں چلتی گئی، اچھی مشاعراتی تیکنیک ہے۔بہر حال یہ ایک معصوم سی لغزش تھی جسے اب بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن ستیہ پال آنند ایک معصوم لغزش کو چھپانے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔انہوں نے ہرگز ہرگز غلام محمد قاصر کا نام لے کر شعر نہیں سنائے تھے۔اس کا ثبوت ان کی ایک میل سے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے مجھے ۲۵ر ستمبر کو بھیجی تھی:

''اس کوی سمیلن میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ اپنی نظموں کے علاوہ اردو کے مشہور شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار سنائیں۔مجھے کچھ اشعار یاد تھے وہ میں نے سنا دیئے۔شعراء کے نام نہیں واضح کیے گئے۔کیونکہ یاد نہیں تھے۔آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود غزل نہیں کہتا۔اور میں نے کبھی کوئی غزل کسی مشاعرے میں نہیں پڑھی۔''(ستیہ پال آنند کی ای میل بنام حیدر قریشی۔۲۵ستمبر ۲۰۱۱ء)

اس ای میل میں ستیہ پال آنند اعتراف کر رہے ہیں کہ شعراء کے نام یاد نہیں تھے اس لیے واضح نہیں کیے۔جبکہ اب ۱۵ر نومبر کی وضاحت میں لکھتے ہیں انہوں نے غلام محمد قاصر ہی کا نہیں فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، ظہور اعوان کا نام بھی لیا تھا اور ان کے اشعار بھی سنائے تھے۔بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو بھی شاعر کے طور پر نہ صرف بیان کیا بلکہ ان کے شعر بھی سنا دیئے۔یہ ہوتی ہے ''بیان ٹمپرنگ'' اسے سفید جھوٹ کہا جاتا ہے۔

(مکمل مضمون اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۳ تا ۳۸ پر مکمل شواہد کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں)

ستیہ پال آنند کی نظم ''دھرتی پران''

(مطبوعہ: ماہنامہ کتاب نمائی دہلی۔جون ۱۹۹۹ء)

چاند کی بڑھیا اونگھ گئی کچھ دیر کو، لیکن جب جاگی تو اس نے دیکھا، دھرتی بالکل بدل گئی تھی۔۔۔۔سبز گھنے جنگل، نیلے ساگر، ندیاں نالے، جھیلیں، برفانی تودے، جھر جھر کرتے فواروں سے ابل ابل کر گرتے جھرنے، گھاس، جھاڑیاں، دور تلک پھیلے میدانوں میں چرتے آزاد مویشی، پنکھ پکھیرو اور دو پائے، چونک گئی کچھ، کچھ گھبرائی چاند کی بڑھیا!۔۔۔وہ آڑی ترچھی، بے ہنگم سی ریکھائیں، جو دھرتی کے بیٹے مل کر سرحد سرحد کھینچ رہے تھے۔دھرتی کے سینے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ رہے تھے۔۔۔۔بڑے بڑے ٹکڑے دھرتی کے، جن میں لاکھوں لوگ، قبیلے، نسل، رنگ اور قومیت کی بنیادوں پر اپنی ماں کو بانٹ رہے تھے۔۔۔۔۔یہ کیسا طوفان تھا، جو اک چھتری کی مانند ہوا میں اونچا اُٹھتا، کھنب کی صورت دھرتی کے سینے سے اُبھرتا، شعلوں میں ملبوس کسی راون سا جلتا، میلوں اونچا، دور خلا تک اس کی جانب لپک رہا تھا!

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم ''اک کتھا انوکھی'' (مطبوعہ ۱۹۹۰ء)

اک جنگل تھا / گھنی گھنیری جھاڑیوں والا / بہت پرانا جنگل / جس کے اندر اک کُٹیا میں / اپنے بدن کی چھال میں لپٹا / اپنی کھال کے اندر گم صُم / جانے کب سے / کتنے جگوں سے / پھٹے پرانے چوغے پہنے / وہ اک خستہ بیج کی صورت / بے سُدھ / بے آواز پڑا تھا! / ۔۔۔''اب تو اُٹھ جا / آخری جُگ بھی بیت چکا / سورج میں کالک اُگ آئی / چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا / دیکھ کہ گھاس جلی جھلسی ہے / ندیوں میں جل سوکھ گیا۔۔۔۔اُس کے لب پر / جاگ اُٹھی مُسکان رَسیلی / بوجھل پلکوں کی درزوں سے / جھانکا / اُس کے من کا اُجالا / اُس نے جیسے / کروٹ لی ہے / اور پوچھا ہے: / کہاں ہوں میں؟ کیا سَمے ہوا ہے؟؟ / ۔۔۔۔یہ سب / نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں! / ساگر جس نے / ان کیڑوں کو جنم دیا تھا / اب اک گندا جوہڑ بن کر / ان کے اندر کے جوہڑ سے / آن ملا ہے / ساگر کا ایمان ہوا ہے / ساگر ماں ہے / ماں ہتھیا / اس کلجگ کا ایمان ہوا ہے! / ۔۔۔اور اب۔۔۔یہ سب / گندے کیڑے / جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں / جنگل جس نے کتنا ان سے / پیار کیا تھا / ۔۔۔آج وہی طوفان / نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے / لیکن اب کی بار یہ طوفاں / اگنی کا ہے / جلے ہوئے کیسر کے ڈنٹھل / شعلوں کے گرداب / ہوا کا شور / گھنے بادل کے تن پر / دھڑ دھڑ پڑتے / آگ کے دُرّے / ایک عجب کہرام بپا ہے / ۔۔۔۔

وزیر آغا نے انسان کے اندر اور باہر کو دو کردار بنا کر بات کی تھی، آنند صاحب نے چاند کی بڑھیا کو بیچ میں ڈال دیا ہے۔آنند صاحب کی اس نظم کے مزید ایکسرے بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن پہلے اس ایکسرے سے تشخیص ہو جائے''(ادبی خبرنامہ ''اردو دنیا'' جرمنی شمارہ نومبر ۱۹۹۹ء)۔۔**یہ ویسا ہی توارد ہے جیسا غزل کے مضامین میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔****(مضمون ''ستیہ پال آنند سے لاگ اور لگاؤ'' سے اقتباس۔از کتاب ہذا صفحہ نمبر ۲۷۔۲۸)**

ستیہ پال آنند کی ’’۔۔۔بُودنی نابُودنی‘‘

حیدرقریشی

چنداضافوں کے ساتھ دوسرا اور انٹرنیٹ ایڈیشن

سال۲۰۱۴ء

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد

Satya Pal Anand ki ".....Boodni Naa-Boodni"

(Articles)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition: 2013

Price: Rs. 75/-

نام کتاب: ستیہ پال آنند کی ’’۔۔۔بُودنی نابُودنی‘‘

مصنف: حیدرقریشی

مصنف کا پتہ: Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim,Germany

E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشدخالد

سرورق کا موضوع: شہرت کے حصول کی بے لگام خواہش

سنِ اشاعت اول: نومبر 2013 ء

قیمت: ۷۵ روپے

مطبع: جاوید بٹ پرنٹنگ پریس۔لاہور

Published By

AKKAS INTERNATIONAL

House No 1164 Street No 2 Block C

National Police Foundation ,Sector O-9

Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan

Tel.0300-5114739 0333-5515412

....

E- Mail:

akkasurdu2@gmail.com

انتساب

یارِ عزیز ارشد خالد کے نام

میں اک ازلی راہی
ساتھ نہ ہو یونہی
پھر سوچ لے چن ماہی!

غم ہو یا خوشی ہو، وہ محبت ہو کہ نفرت
ہم نے کوئی جذبہ بھی چھپا کر نہیں رکھا

ترتیب

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رہتی ہے پرواز کی خوش فہمی اُن کو
جو اپنے اندر کے خلا میں گرتے ہیں

ابتدائیہ

ستیہ پال آنند کی ’’۔۔۔بُودنی نابُودنی‘‘

اس کتاب کا نام ستیہ پال آنند کی ایک نظم کے عنوان ’’کون وفسادو بودنی نابودنی‘‘ سے اخذ کیا گیا ہے۔یہ نظم میرے مضمون ’’دونظموں کا قضیہ‘‘ میں شامل ہے۔اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قارئین کتاب کے نام کواس کے پورے تناظر میں زیادہ بہتر طور پر جان لیں گے۔

ستیہ پال آنند اردوادب کے ایک عمدہ تخلیق کار ہیں۔لیکن وہ اپنے تخلیقی اظہار کے پیمانے کا شاید درست تعین نہیں کر سکے۔قیامِ پاکستان کے زمانے سے وہ افسانے لکھتے رہے تھے۔مجھے لگتا ہے کہ ان کا اصل میدان افسانہ ہی تھا لیکن پھر وہ نظم نگاری کی طرف آ گئے۔ان کی افسانہ نگاری سیدھے سادے بیانیہ پر مبنی تھی تو نظم نگاری کے لیے انہوں نے جدید پیرایہ کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہر تخلیق کار کی تخلیق کا جدید یا روایتی پیرایہ اس تخلیقی لمحے کی عطا بھی ہوجاتا ہے،جس میں وہ ظہور کرتا ہے۔ستیہ پال آنند کے بقول احمد ندیم قاسمی نے انہیں ایک عمر کے بعد کہا کہ:

’’آپ نے تو کہانی کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا،لیکن کہانی نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔دیکھ لیجیے، آپ کی لگ بھگ سب نظموں میں کہانی چپکے سے درآتی ہے!‘‘

(جدید ادب شمارہ نمبر ۱۲۔جنوری تا جون ۲۰۰۹ء۔صفحہ نمبر ۲۸۴)

میرا ذاتی خیال بھی یہ ہے کہ ستیہ پال آنند بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔افسانے میں اپنے روایتی انداز کے باوجود ان کے اندر کا عمدہ تخلیق کار اپنے رستے تراشتا چلا جاتا۔نظم نگاری میں بھی

ان کے پاس اپنے امکانات کو ظاہر کرنے کے مواقع تھے لیکن ایسے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی نظموں سے مطمئن نہیں رہے۔ایک عمدہ تخلیق کار کے ہاں ایسا عدم اطمینان خوب سے خوب تر کی جستجو کے طور پر ہوا کرتا ہے۔ستیہ پال آنند بھی اپنے اندر کے عمدہ تخلیق کار کو اس راہ پر لگا لیتے تو اطمینان نہ سہی ایک تخلیقی آسودگی ضرور انہیں مل جایا کرتی۔لیکن ہوا یہ کہ اپنے اندر کے عمدہ تخلیق کار پر بھروسہ کرنے کی بجائے انہوں نے شہرت کے حصول کے لیے مختلف قسم کے شارٹ کٹ تلاش کرنا اور اختیار کرنا شروع کر دیئے۔جب اچھے تخلیق کار اس نوعیت کی حرکات میں مبتلا ہوتے ہیں تو نہ صرف بے برکتی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں بلکہ تخلیق کی دنیا انہیں اپنے آباد دیار سے باہر نکال کر بنجر اور بانجھ ویرانوں کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ستیہ پال آنند جتنا شارٹ کٹ اختیار کرتے گئے،عمدہ ادب کی تخلیق سے اتنا ہی محروم ہوتے چلے گئے۔غیر ادبی دیویوں کے چکر میں ان کی حرکات جتنی مضحکہ خیز ہوتی گئیں،اتنا ہی ادب کی دیوی انہیں رد کرتی چلی گئی۔کسی تخلیق کار کا اپنی تخلیق کے اظہار کے ساتھ اس میں قارئین کی شرکت کی خواہش کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔تخلیق کی اولیت اور اہمیت کی بنیاد پر یہ شہرت کا باوقار طریقہ ہوتا ہے۔لیکن اس میں کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔میری اس کتاب کے مضامین یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جب کوئی عمدہ تخلیق کار اپنی تخلیقی لگن میں مگن رہنے سے زیادہ شہرت کے شارٹ کٹ ڈھونڈنے لگتا ہے تو پھر اس کا کیا انجام ہوتا چلا جاتا ہے۔

ستیہ پال آنند کی شاعری جیسی بھی ہے،وہی ان کی شعری پہچان بنے گی اور اسی کی بنیاد پر ان کے اہم یا غیر اہم شاعر ہونے کا فیصلہ ہوگا۔ابھی تک کا جو منظر دکھائی دے رہا ہے اس کے مطابق ستیہ پال آنند اپنے تخلیقی جوہر پر بھروسہ کرتے ہوئے نظمیں کہنے سے زیادہ پبلک ریلشنگ سے کام لے کر شہرت کمانے کے شارٹ کٹ اختیار کرتے پائے جاتے ہیں۔وہ اچھی نظمیں لکھنے کی کاوش کرنے سے زیادہ غزل کی مخالفت کر کے مشہور ہوتے ہیں۔اب ان کی پہچان اچھے نظم نگار کی نہیں بلکہ ایک ’’غزل مخالف‘‘ کی پہچان ہے۔ایک طرف ایسا ہو رہا ہے دوسری طرف وہ غزل کے اشعار سے مرکزی خیال اُڑا کر اپنی دانست میں نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔غزل کے کسی شعر کا خیال اُڑا کر اسی کو موڑ توڑ کر نظم میں ڈھال لینا اپنی جگہ،شہرت کے حصول کے لیے انہیں کسی غیر اردو

ماحول میں ہندی والوں کے سامنے کسی غزل گو شاعر کی کسی مقبول غزل کے اشعار اپنے نام سے سنانے کا موقعہ مل جائے تو اس سے بھی گریز نہیں کرتے۔اس سلسلہ میں غلام محمد قاصر کی غزل کے دوشعر اپنے نام سے سنانے کا ان کا اسکینڈل ساری اردو دنیا کے علم میں ہے۔اس حوالے سے میرا مضمون ’’اردو غزل کا انتقام۔ستیہ پال آنند کا انجام‘‘اس کتاب میں شامل ہے۔اس مضمون میں تقریباً ساری تفصیل آگئی ہے۔

شروع میں ہی جب میں نے اپنا مضمون ’’غزل بمقابلہ نظم‘‘ لکھا تو اس میں ستیہ پال آنند کو کسی الجھاؤ کے بغیر اور نام لیے بغیر ان کے ایک مضمون کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا۔

’’پہلی بات تو یہ کہ بھائی!اگر آپ آزاد نظم کے شاعر ہیں تو اپنی نظموں پر توجہ دیں،تا کہ پھر ادب کے قارئین بھی آپ کی نظم کی طرف متوجہ ہوسکیں۔اپنی تخلیقات کے بل پر قارئین کو اپنی نظموں کی طرف متوجہ نہ کر سکنے والے شعراء کو یہی رستہ سوجھا ہے کہ حیلے بہانے سے غزل کو ملامت کرتے رہو،اس میں کیڑے ڈالتے رہو اور غزل مخالف ہونے کی سند حاصل کر کے لوگوں کی توجہ حاصل کرلو۔لیکن کیا اس طریقے سے مخالفینِ غزل خود کو اہم نظم نگار منوالیں گے؟اس کے لیے تو اچھی نظمیں لکھنا ہوں گی اور اچھی نظمیں کسی ورکشاپ میں تیار نہیں کی جاتیں۔غزل کی مخالفت میں اب با قاعدہ کھاتے کھتونیوں کے انداز میں چارٹ بنا کر لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی جانے لگی ہے۔‘‘

(مضمون:غزل بمقابلہ نظم)

اس مضمون کے اختتام پر میں نے انہیں واضح طور پر مشورہ دیا تھا کہ:

’’جہاں تک غزل کی بقا اور ترقی کا مسئلہ ہے یہ تخلیقی اذہان کے ذریعے تب تک زندہ رہے گی جب تک اردو زبان زندہ ہے۔نظم سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے،کوئی مخاصمت نہیں ہے۔جو نظم نگار غیر ضروری طور پر غزل کی مخالفت میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ غزل کے غم میں ہلکان نہ ہوں اور اچھی نظمیں کہنے پر توجہ دیں تا کہ پھر ان کا نام ان کی اچھی نظموں کی وجہ سے یاد رکھا جا سکے۔‘‘

کاش ستیہ پال آنند نے میرے مشورے پر توجہ فرمائی ہوتی!

ستیہ پال آنند نے ایک طرف احمد فراز پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ وہ ادب سے بے بہرہ خواتین کے جمگھٹے میں بیٹھ کر اسے اپنی ادبی مقبولیت سمجھتے تھے۔دوسری طرف اپنا یہ حال کہ فراز کے مقابلہ میں ایک دو پرسنٹ خواتین کا قرب بھی نصیب ہوا تو غزل کے بے وزن مطبوعہ مجموعے کی شاعرہ کے سرپرست بن گئے۔دوسری طرف ہیمبرگ میں ایک ایسی خاتون کے ایسے شعری مجموعہ کی تقریب رونمائی کے لیے دوڑے چلے گئے،جو سراسر روایتی غزل کے انداز میں بے وزن شاعری کرتی ہیں۔رات بھر ان کے مسودہ پر اصلاح دیتے رہے اور اگلے دن ہمبرگ جا کر کتاب کی اشاعت کے بغیر رونمائی کر دی۔اسے غائبانہ نمازِ جنازہ کے انداز کی غائبانہ تقریب رونمائی کہہ سکتے ہیں۔ہاں کتاب چھپنے کے بعد ایسا کرتے تو اسے غزل کی حاضر نمازِ جنازہ کہہ سکتے تھے۔کیونکہ جس کلام پر ستیہ پال آنند اصلاح فرماتے رہے تھے،وہ غزل کی نہیں پوری شاعری کی موت کا اعلان تھا۔یہ تو خواتین کے معاملہ میں ستیہ پال آنند کے عمومی کردار کی مثال ہے۔ادبی دنیا میں دیکھیں تو ادبی رسائل کے بعض مدیران کے ساتھ انہوں نے کچھ الگ قسم کے مراسم بنا رکھے ہیں۔میں نام لیے بغیر انگریزی کی بجائے اردو میں صرف بطور علامت ایک مثال بیان کروں گا۔ستیہ پال آنند نے خود بتایا تھا کہ میں فلاں رسالہ کے مدیر کی اہلیہ کو ہر سال عیدی کے طور پر ایک معقول رقم بھیجتا ہوں۔

بھائی! رسالے کو سپورٹ کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔سیدھے سیدھے تعاون کرو۔کوئی عیدی کا بہانہ کرنا ہے تو مدیر کے بچوں کے لیے عیدی بھیجو۔یہ بہنیں، بھانجیاں،بھتیجیاں،بہوئیں اور بیٹیاں بنانے کا کیا ڈرامہ ہے۔اردو دنیا میں اس حوالے سے پہلے ہی بہت کچھ شرمناک ہو چکا ہے۔خواتین کا احترام ظاہر کرنا مقصود ہے تو کسی نام نہاد رشتے داری کے بغیر انسانی رشتے کے حوالے سے احترام کرو۔اس نوعیت کی رشتہ داریاں ہمیشہ ’’کھجل اور خوار‘‘ کراتی ہیں۔خود ستیہ پال آنند کو جب ایک بار ارشد خالد سے با قاعدہ تحریری معافی مانگنا پڑی،وہ بھی ایک منہ بولی بیٹی کی وجہ سے اس حال کو پہنچے تھے۔بھانجیاں،بھتیجیاں،بیٹیاں،بہوئیں اور بہنیں بنانے والے اس مزاج کے بعض لوگوں کو میں نے بہت پہلے مشورہ دیا تھا کہ فیس بک پر ’’فین کلب‘‘ کی جگہ ’’بھَین کلب‘‘

بنالیں۔کسی رسالہ کے مدیر کے ساتھ تعلقات بنائے رکھنے کا باوقار طریقہ چھوڑ کرانہوں نے شہرت کے شارٹ کٹ والا طریق اختیار کیا۔

ایک اور شارٹ کٹ انہوں نے یہ اختیار کیا کہ چند نعتیہ نظمیں لکھ دیں۔اگر یہ نعتیہ نظمیں ان کے دل کی آواز ہیں تو رسولؐ کے صدقے اللہ انہیں جزائے خیر دے۔لیکن ان کے شہرت کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے مختلف حربوں کو ذہن میں رکھا جائے تو یہاں بھی یہی لگتا ہے کہ یہ بھی ایک خاص نسخہ ہے۔ان کا نعتیہ کلام ہندوستانی معاشرت کے حوالے سے مندر اور مسجد والوں کو قریب لانے کا باعث بن سکتا تھا۔لیکن یہ تو ان کا مقصد ہی نہیں ہے۔مقصد صرف الگ الگ مقامات پر شہرت کمانا ہے۔اگر مندر میں نعت سناتے اور اردو تقریبات میں بھجن سناتے تو شاید کچھ نیک نیتی کا اندازہ ہوتا۔سماجی سطح پر کسی رواداری کو فروغ دینے کا رویہ بھی ظاہر ہوتا۔لیکن یہاں تو ''با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام'' والی بات ہے۔چلیں اس میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن یہ آپ کا سماجی طریق کار ہے۔اسے سماجی سطح پر رہنے دیا جائے۔ادب کے نام پر ایسا کیا جائے گا تو یہ مناسب طریقِ کار نہیں بلکہ خاص طریقۂ واردات کہلائے گا۔

نعتیہ کلام کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی روایات (اور بدھ روایات)، سے بھی ستیہ پال آنند نے کافی سارا استفادہ کیا ہے۔ایسا کوئی استفادہ یا اکتساب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے،لیکن استفادہ کرنے والا تخلیق کار اس اکتساب سے تخلیقی سطح پر کچھ نیا بھی تو لے کر آئے،محض بھاری کم الفاظ اور بعض روایات کے اشارے دے کر لفاظی کرنے سے اچھی نظم تو نہیں ہو جاتی۔عربی، فارسی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے نظم کہنے کے نام پر ایسی لفاظی سے پھر آپ اردو والوں کی تقریبات میں شاید تھوڑی بہت داد حاصل کرلیں گے۔لیکن کیا ایسا کلام مندروں کے سمیلن میں بھی سنائیں گے؟

یہ ساری حرکتیں کسی تخلیقی تحرک کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ شہرت کمانے کی مختلف ترکیبیں ہیں۔ان میں کوئی نیک مقصد یا کسی نوعیت کی عقیدت شامل دکھائی نہیں دیتی۔

اکتساب اور استفادہ سے آگے بڑھ کر ستیہ پال آنند نے سرقہ کا ارتکاب بھی کیا ہے اور بار بار

کیا ہے۔میں انہیں اس حوالے سے سال ۱۹۹۹ء سے اب تک متعدد بار ان سرقات کی طرف متوجہ کر چکا ہوں۔ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم ''اک کتھا انوکھی'' سے انہوں نے سرقہ کیا اور اپنی نظم ''دھرتی پران'' لکھ ڈالی۔(۱) غلام محمد قاصر کی غزل کے اشعار درگا مندر امریکہ کے کوی سمیلن میں مزے سے اپنے کلام کے طور پر سنا دیئے۔جب چوری پکڑی گئی تو ایک ہی وقت میں ان کی طرف سے دو متضاد جواب آئے جن سے ان کے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ گیا۔(۲) اردو غزل کو مضامین کے کلیشے بن جانے کے الزام سے مطعون کرتے کرتے خود غزل کے مضامین اُڑا کر نظم کہنے لگ گئے۔(۳) یہ سارے حقائق مکمل ثبوت کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کیے جا چکے ہیں،اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ابھی تک انہوں نے تحریری طور پر ایک بار بھی اپنا دفاع کرنے کی جرات نہیں کی۔کسی نوعیت کی صفائی پیش نہیں کی۔

ستیہ پال آنند کی ادبی زندگی کے آغاز پر ایک پردہ سا پڑا ہوا ہے۔حقائق تک رسائی حاصل کر سکنے والے کسی دوست کو اس معاملہ میں غیر جانبدارانہ طریق سے تحقیق کرنا چاہیے۔میری معلومات کے مطابق ستیہ پال آنند نے ہندوستان میں پہلے انگریزی اور ہندی میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔پھر انہیں لگا کہ وہاں جتنا وسیع میدان ہے اس سے کہیں زیادہ سخت مقابلہ ہے۔چنانچہ ان کی آرام طلب اور عافیت کوش طبیعت نے اردو کو تختۂ مشق بنا لیا۔اگر واقعی ایسا ہی ہوا ہے تو اس عرصہ کی الگ الگ زمانی تقسیم کی جانی چاہیے تا کہ اندازہ ہو کہ اردو سے ان کی محبت کب جاگی اور یوں ان کی ادبی زندگی کے رنگ ڈھنگ پوری طرح واضح ہو سکیں۔

میں بار بار لکھ رہا ہوں کہ ستیہ پال آنند شہرت کے حصول کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ پہلے انہوں نے ارشد خالد مدیر عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کو ایک نازیبا ای میل بھیجی۔جب ارشد خالد نے انہیں ان کی زیادتی کا احساس دلایا تو حقائق جاننے کے لیے کچھ مہلت مانگ لی۔ان کا خیال تھا کہ چند دنوں میں بات رفت گزشت ہو جائے گی۔ارشد خالد نے مقررہ مہلت کے بعد انہیں یاددہانی کرائی اور آڑے ہاتھوں لیا تو سیدھے معافی مانگنے پر اُتر آئے۔ان کی پہلی حرکت شہرت کے حصول کا حربہ تھا،جب

وہ حربہ ناکام ثابت ہوا تو جان چھڑانے کی کوشش کی۔آسانی سے جان نہیں چھوٹی تو معافی مانگ کر جان چھڑائی۔یوں شہرت کے حصول کا یہ حربہ انہیں خاصا مہنگا پڑا۔کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوجاتا ہے۔

ستیہ پال آنند ایک ہی وقت میں۔۔۔دنوں کے فرق کے ساتھ نہیں،گھنٹوں اور منٹوں کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ ایک ہی وقت میں ایک طرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی امریکہ میں آمد کے موقعہ پر ان کی شان میں قصیدہ نما ایک انگریزی مضمون لکھ کر اور اسے امریکہ میں شائع کرا کے ان کا استقبال کرتے ہیں۔اور اسی لمحے میں فیس بک پر عمران بھنڈر کی توصیف بھی کر رہے ہیں۔ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ہی وقت میں کی گئی پبلک ریلیشنگ کی یہ ساری گیم بے نقاب ہوجائے گی۔ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا فیس بک سے کوئی واسطہ نہیں ہے،انہیں اس بات کا علم ہی نہیں ہو پائے گا۔لیکن یہ بات انہیں لمحوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک پہنچ گئی، پھر ڈاکٹر نارنگ نے طویل کال کر کے ستیہ پال آنند کے ساتھ جو کچھ کیا، جو کچھ کہا وہ ستیہ پال آنند جانتے ہیں اور ان کا خدا جانتا ہے۔میں یہ سارے حقائق اپنے مضامین میں پہلے سے شائع کر چکا ہوں، یہاں مختصراً اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ایک ہی مضمون میں ان کی شخصیت اور کردار کا یہ رُخ اچھی طرح سامنے آجائے کہ شہرت کے حصول کے لیے کوئی معیاری اور اچھی نظمیں لکھنے کا باوقار طریق اختیار کرنے کی بجائے ستیہ پال آنند کوئی بھی حربہ،کوئی بھی نسخہ کاری گری کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔اور ایسی واردات کرتے ہوئے کئی بار رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔چند وارداتوں کا میں نے اشارتاً ذکر کر دیا ہے۔

جب ہم جدید نظم کی بات کرتے ہیں تو میرا جی، راشد، اختر الایمان، مجید امجد، فیض احمد فیض اور وزیر آغا تک اچھے نظم نگاروں کی کئی اہم نظموں کا ذکر کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعراء اپنی فلاں فلاں نظموں کے باعث ہی ادب کی دنیا میں زندہ رہیں گے۔لیکن ستیہ پال آنند کے بارے میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ ابتدا میں عمدہ تخلیق کار ہونے کے باوجود ان کے دامن میں ایک نظم بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ یہ ان کی بڑی نظم ہے اور اس نظم کو ان کی شناخت مان کر ادب میں ان کا نام زندہ رہے گا۔ہندوستان میں دو بڑے نقاد موجود ہیں۔ڈاکٹر

گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی۔یہ دونوں نقاد اگر بتا دیں کہ ستیہ پال آنند کی کون سی نظم بڑی نظم ہے، جس کے حوالے سے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جا سکے گا تو میں بھی اس کا اقرار کر لوں گا۔۔۔بلکہ میں ستیہ پال آنند کو مزید سہولت دیتا ہوں۔انہوں نے چونکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے انگریزی میں ایک نہایت خوشامدانہ مضمون لکھا ہوا ہے، جسے پڑھ کر ڈاکٹر نارنگ بھی ہنسے تھے۔چلیں وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب سے ہی لکھوا دیں کہ ستیہ پال آنند اپنی فلاں نظم کے باعث ادب کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ایک نظم کا سوال ہے بابا!

میں نے اپنے مضمون "غزل بمقابلہ نظم" میں انہیں سیدھا سا مشورہ دیا تھا کہ:

"ان سے درخواست ہے کہ وہ غزل کے غم میں ہلکان نہ ہوں اور اچھی نظمیں کہنے پر توجہ دیں تاکہ پھر ان کا نام ان کی اچھی نظموں کی وجہ سے یاد رکھا جا سکے۔"

میرے مشورے کے بعد بھی انہوں نے شارٹ کٹ کی عادت ترک کر کے اچھی نظمیں کہنے کی طرف توجہ کی ہوتی تو اب تک ان کے دامن میں ایک دو اچھی نظمیں ضرور موجود ہوتیں۔اور اس عبرت ناک حال کو نہ پہنچے ہوتے کہ ہندوستان کے دو ممتاز نقاد مل کر بھی ان کے ہاں کسی ایک اچھی نظم کی نشان دہی نہ کر پائیں اور ایسے کسی مطالبہ پر خاموش رہنے کو ترجیح دیں۔

یہ ایک عمدہ تخلیق کار کا اپنے آپ پر اعتماد نہ کر کے بھٹک جانے کا المیہ ہے۔

افسانہ نگار و نظم نگار ستیہ پال آنند کے تخلیقی طور پر بے برکتی کا شکار ہو کر ضائع ہوجانے کی کہانی ہے!

لگتا ہے ستیہ پال آنند سے صرف اردو غزل نے ہی انتقام نہیں لیا، ان کے اندر کے افسانہ نگار نے بھی ان سے انتقام لیا ہے اور انہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔

حاشیہ:

(۱)اس کی نشان دہی اس کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷،۲۸ پر موجود ہے۔

(۲)دو متضاد جواب دینے کی تفصیل اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۴ تا ۳۷ پر ملاحظہ کریں۔

(۳)اس کے ناقابلِ تردید ثبوت اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۵۴ اور ۵۹ پر دیکھیں۔

غزل بمقابلہ نظم

غزل کا اپنا ایک مزاج ہے جو مشرقی مزاج کی اجتماعی ترجمانی کرتا ہے۔غزل کے برعکس نظم اور بالخصوص آزاد نظم کا مزاج انفرادی نوعیت کا ہے۔دونوں شعری اظہار کے الگ الگ پیمانے ہیں۔دونوں کا باہمی طور پر کوئی جھگڑا یا مقابلہ نہیں ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ مغرب کے بہت زیادہ زیرِ اثر نظم کے حامیوں نے غیر ضروری طور پر نظم کے فروغ کے لیے ضروری سمجھا کہ غزل کو ہدفِ تنقید بنایا جائے۔اس سلسلے کی سب سے اہم مثال کلیم الدین احمد رہے۔انہوں نے غزل کے خلاف انگریزی سے مستعار ایک جملہ کہہ کر اپنی دانست میں بہت بڑا معرکہ سر کر لیا۔

اردو غزل کے مخالفین جو اردو شاعری سے اور غزل سے بطور خاص بڑے بڑے مطالبے کر رہے تھے، جب خود شاعری کرنے پر آئے تو پتہ چلا کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز شعراء کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کے شاعر بھی نہیں ہیں۔بہر حال وقفے وقفے سے غزل کی مخالفت میں بیان بازی چلتی رہی ہے، چلتی رہتی ہے۔

غزل کے بعض پہلوؤں پر اعتراض کرنے یا اس کی بہتری کے جذبہ کے تحت خامیوں کی نشاندہی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔جن دوستوں نے اس جذبہ کے تحت کچھ لکھا ہے کہ اس سے غزل بحیثیت صنف مزید ترقی کر سکے، وہ سب قابلِ احترام ہیں۔ان کی باتوں پر غور ہونا چاہیے اور خوب سے خوب تر کے امکانات پر مکالمہ ہوتا رہنا چاہیے۔یہاں اس افسوس ناک صورت حال کا ذکر بھی کر دوں کہ ایک زمانہ تھا جب شاعر نہ ہوتے ہوئے عوام میں ادبی ذوق پایا جاتا تھا اور ان میں شعر فہمی کی عمدہ سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔کہیں کسی نے شعر پڑھا اور اس میں کہیں جھول محسوس ہوا تو لوگ باگ ایک دوسرے کو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتے۔لیکن اب اس ادبی ذوق کی حالت اس عبرتناک مقام پر پہنچی ہوئی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا

خاص طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو عوامی رابطے کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں ان میں بے دھڑک بے وزن شعر سنائے جاتے ہیں اور پروگرام پیش کرنے والوں کے اپنے ادبی ذوق کا یہ حال ہوتا ہے کہ بے وزن اشعار پر داد دے رہے ہوتے ہیں۔ایسی فضا میں ایسی کوئی خواہش کرنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ ٹی وی چینلز کو معیاری اردو ادبی پروگرام شروع کرنے چاہئیں۔

ہم کو ان سے "ادب" کی ہے امید............؟

غزل کے نام پر جگالی کرنے والے شاعروں سے لے کر مجروں جیسی مشاعرہ بازی کرنے والوں تک کی سرکوبی کی جانی چاہیے۔دوسروں سے لکھوا کر شاعر بن جانے والوں سے لے کر ان کو پورے مجموعے لکھ کر دینے والے کاروباری شاعروں کی نشاندہی ہونی چاہیے۔یہ سارے منفی عوامل ہیں جن سے عام قارئین میں ہی نہیں عام شاعروں میں بھی ادب کی سوجھ بوجھ ختم ہوتی جا رہی ہے لیکن ان سب کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس ساری صورتحال کی ذمہ داری غزل پر ڈال کر غزل کو اردو بدر کرنے کے مشورے دیئے جانے لگیں۔بلکہ اگر الزامی جواب کے رنگ میں دیکھا جائے تو غزل کی بجائے آزاد نظم اور پھر "نثری نظم" پر اس کا الزام زیادہ لگتا ہے کہ انہوں نے آ کر غزلیہ یا پابند شاعری کے ردھم کو توڑ کر عوام کو شاعری کے بنیادی شعور سے بے بہرہ کر دیا تاہم یہ بات صرف الزامی جواب کے رنگ میں ہے ورنہ میرے نزدیک آزاد نظم اہم شعری صنف ہے اور غزل کے بعد ابھی تک سب سے مقبول اردو شاعری ہے۔

اس وقت کلیم الدین احمد کی طرح شہرت حاصل کرنے کے چکر میں الجھے ہوئے بعض نظم نگار شعراء غزل کی مذمت کا "کارِخیر" انجام دینے میں مشغول ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ بھائی! اگر آپ آزاد نظم کے شاعر ہیں تو اپنی نظموں پر توجہ دیں، تاکہ پھر ادب کے قارئین بھی آپ کی نظم کی طرف متوجہ ہو سکیں۔اپنی تخلیقات کے بَل پر قارئین کو اپنی نظموں کی طرف متوجہ نہ کر سکنے والے شعراء کو یہی رستہ سوجھا ہے کہ حیلے بہانے سے غزل کو ملامت کرتے رہو، اس میں کیڑے ڈالتے رہو اور غزل مخالف ہونے کی سند حاصل کر کے لوگوں کی توجہ حاصل کر لو۔لیکن کیا اس طریقے سے مخالفینِ غزل خود کو اہم نظم نگار منوا لیں گے؟ اس کے لیے تو اچھی نظمیں لکھنا ہوں گی اور اچھی نظمیں

کسی ورکشاپ میں تیار نہیں کی جاتیں۔غزل کی مخالفت میں اب باقاعدہ کھاتے کھتونیوں کے انداز میں چارٹ بنا کر لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی جانے لگی ہے۔اس پر مجھے آج کے ایسے جدید تر ذہنوں کے مقابلہ میں پرانے دور کے بزرگ شاعر ہمت رائے شرما یاد آ گئے۔سال ۲۰۰۴ء میں غزل کی تفہیم (مخالفت) کے لئے جو چارٹ بنا کر کلاس لگائی جا رہی ہے اس انداز کے اعتراضات کا جواب آج سے ۲۰ سال پہلے ہمت رائے شرما نے اپنے شعری مجموعہ ''شہاب ثاقب'' میں یوں دیا تھا:

''میری مراد اس طبقے سے ہے جسے ہر بات کا ٹھوس اور بین ثبوت چاہیے جسے ہر کام ناپ تول کر کرنے کی عادت ہے جس کے لئے محبت کا ایک خاص معیار ہے جو چکوری کو چاند تک پہنچنے کے لیے میلوں ،کلومیٹروں اور گھنٹوں کا حساب کرتا ہے۔جو پروانے کے جلنے کے لئے شمع کا درجہ حرارت ناپتا ہے جو آنسوؤں کے لیے مقیاس المطر ڈھونڈتا ہے۔میں سمجھتا ہوں شاعری فقیروں کا حصہ ہے۔حساب دانوں اور سائنسدانوں کا نہیں''

غزل پر بے جا اعتراض کر کے شہرت کمانے کے خواہشمند نظم نگار دوستوں سے اتنی گزارش ہے کہ غزل اور نظم کو ایک دوسرے کے حریف کے طور پر پیش نہ کریں۔دونوں کے اپنے اپنے جہان ہیں اور دونوں میں ہی بہت اچھی تخلیقات کے ساتھ بہت سارا ٹریش بھی پیش کیا جا رہا ہے۔میرے نزدیک اس عہد کے سب سے اہم اور معتبر نظم نگار ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ان کی نظموں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کو میں اردو کی شاہکار آزاد نظموں میں شمار کرتا ہوں۔ڈاکٹر وزیر آغا جیسے جدید شاعر اور معتبر نقاد تو عالمی سطح پر بدلتی ہوئی دنیا کے منظر نامہ میں اکیسویں صدی میں غزل کی مقبولیت کے امکان کو اجاگر کر رہے ہیں۔اور ہمارے گزارے لائق نظمیں کہنے والے اور ورکشاپوں میں نظمیں ڈھالنے والے دوست غزل کو اردو بدر کرنے پر تلے

ہوئے ہیں۔یہاں ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک مضمون کے چند اقتباس یکجا کر کے پیش کئے دیتا ہوں۔

''پوری دنیا قوموں کی سطح سے اوپر اُٹھ کر تہذیبوں کی صورت میں اپنا جلوہ دکھانے لگی ہے۔ان جملہ ''حلقوں'' میں جزو اور کُل کا رشتہ وہی ہے جو غزل کے شعر کا پوری غزل سے ہوتا ہے۔غزل کا ہر شعر اپنی جگہ آزاد ہے مگر ردیف اور قافیہ کی ڈور میں پرویا ہوا بھی ہے۔لہٰذا اس کی حیثیت غزل کے ایک انگ کی ہے۔اسی طرح پوری دنیا ایک ایسی اکائی میں تبدیل ہو رہی ہے جو بالآخر بہت سی اکائیوں کا ایک جالی دار مرکب قرار پائے گی۔ایسے منظر نامے میں غزل ایسی شعری صنف کے مقبول ہونے کے امکانات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے...... یہ تجربہ عام ہے کہ غزل کے شعر کو اگر غزل کے مطلع کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا تاثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں پوری غزل کی خوشبو اور رفتار بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے...... چونکہ غزل ہئیت کے اعتبار ہی سے جڑواں نہیں بلکہ تجسیم اور تجرید کے منطقوں کو بھی جڑواں بنانے پر قادر ہے، اس لیے آئندہ صدی میں اس کے فروغ پانے کے امکانات بھی زیادہ ہوں گے۔واضح رہے کہ یہاں میرا اشارہ اس نئی غزل کی طرف ہے جو پٹے ہوئے کلیشہ زدہ اسلوب شعر کی جکڑ سے آزاد ہوتی ہے۔''

(''اکیسویں صدی میں اردو ادب کے امکانات'' از ڈاکٹر وزیر آغا
مطبوعہ مجلّہ عالمی اردو سیمینار ۲۰۰۰ء، انگلینڈ)

جہاں تک غزل کی بقا اور ترقی کا مسئلہ ہے یہ تخلیقی اذہان کے ذریعے تب تک زندہ رہے گی جب تک اردو زبان زندہ ہے۔نظم سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے، کوئی مخاصمت نہیں ہے۔جو نظم نگار غیر ضروری طور پر غزل کی مخالفت میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ غزل کے غم میں ہلکان نہ ہوں اور اچھی نظمیں کہنے پر توجہ دیں تا کہ پھر ان کا نام ان کی اچھی نظموں کی وجہ سے یاد رکھا جا سکے۔

(مطبوعہ سہ ماہی **شعرو سخن** مانسہرہ، غزل نمبر شمارہ: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم

(ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں ۲۴ مارچ ۲۰۱۰ء کو ہونے والی تقریب میں پڑھا گیا خیر مقدمی مضمون)

اس تقریب کے انعقاد کا خیال تب آیا جب مجھے ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب نے امریکہ سے اطلاع دی کہ وہ انڈیا سے واپسی پر یورپ کا چکر بھی لگائیں گے۔میں نے انہیں کہا کہ جب یورپ آرہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔سوانہوں نے میری فرمائش پر جرمنی آنے کی حامی بھر لی۔میں نے کرسٹینا جی سے پروگرام ترتیب دینے کی بات کی انہوں نے ہمیشہ کی طرح تعاون کر دیا۔یوں ستیہ پال آنند صاحب کے اعزاز میں تقریب کا پروگرام طے کیا جانے لگا۔اسی دوران معلوم ہوا کہ کوپن ہیگن سے صدف مرزا ان کے اس سفر کے انتظامات سنبھالیں گی۔سواس حوالے سے ان کا فون آیا تو انہیں بھی مدعو کرنا واجب ٹھہرا۔یوں ہمارے ایک مہمانِ خصوصی کی جگہ دو مہمانِ خصوصی ہو گئے۔پھر چراغ سے چراغ جلنے کی طرح صدف مرزا کے توسط سے ارم بتول اور شہزادارمان سے رابطہ ہوا اور ان کے ذریعے پاکستان سے جرمنی میں آئے ہوئے شاعر باقر رضا زیدی سے تعارف ہوا۔اور انہیں بھی بطور مہمان خصوصی مدعو کر لیا گیا۔ایک فلمی گانے میں ایک مصرعہ بار بار آتا ہے۔

"ایک۔۔
ایک سے بھلے دو۔۔۔
دو۔۔
دو سے بھلے تین"

سو یوں ہماری آج کی تقریب میں تین مہمانانِ خصوصی موجود ہیں۔باقر رضا زیدی صاحب الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں اور شعروادب سے اپنی وابستگی کو بھی انہوں نے برقرار رکھا ہے۔"صدائے باقر" اور"تم نے کہا تھا" کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔مزید تعارف اب رابطہ کے بعد ہوتا چلا جائے گا۔صدف مرزا سے جب ٹیلی فون پر بات ہوئی تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ ادبی موضوعات پر نہ صرف اچھی گفتگو کر سکتی ہیں بلکہ ان باتوں میں اچھی خاصی ادبی سوجھ بوجھ بھی ملتی ہے۔یہ میرے لیے اس واسطے حیران کن بات تھی کہ عام طور پر ادبی شعور تو اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔بہر حال اس خوشگوار تاثر کے بعد جب ان کی شاعری پڑھنے کا موقعہ ملا تو لگا کہ وہ روانی جو ان کی گفتگو میں تھی،وہ اسی طرح اس شاعری میں نہیں مل رہی جبکہ شاعری میں تو فطری روانی زیادہ ہونی چاہیے تھی۔بعد میں راز کھلا کہ مجموعہ کچھ عجلت میں چھپوالیا گیا تھا۔بہر حال اب توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنے ادبی مطالعہ کو مزید بڑھانے اور ستیہ پال آنند جیسی علمی و ادبی شخصیت کے مشوروں سے ان کے ہاں شعری بہاؤ بھی جوبن پر آتا جائے گا۔

ستیہ پال آنند جی سے میرا تعلق لاگ اور لگاؤ دونوں طرح کا ہے۔یہاں شروع میں ہی وضاحت کر دوں کہ ایسے تعلق کا ایک اعتراف میں اپنی پرانی دوست فرحت نواز کے حوالے سے کر چکا ہوں اور دوسرا اعتراف صرف ستیہ پال آنند جی کے حوالے سے کر رہا ہوں۔یہ ایسا سادہ اور پر پیچ تعلق ہے جہاں لاگ میں بھی لگاؤ ہوتا ہے اور لگاؤ میں بھی لاگ ہوتا ہے۔علمی طور پر ستیہ پال آنند جی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔جب وہ غزل میں پیش پا افتادہ مضامین اور تراکیب کی بھرمار سے کلیشے جیسی صورت بن جانے کی خبر دیتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے۔غزل کی روایتی بھرمار کے مقابلہ میں اصلاح احوال کی امید پیدا ہوتی ہے لیکن اس سے آگے معاملہ جاتا ہے تو غزل کی بقا کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے اور ہم غزل کے چاہنے والے فکرمند ہو جاتے ہیں۔

مغربی دنیا میں مشاعروں کی بھرمار اور اس میں پنپنے والے منفی رویوں کی نشان دہی سب سے پہلے اور سب سے موثر طریقے سے ستیہ پال آنند جی نے کی تھی۔انہوں نے بڑے اعداد و شمار

کے ساتھ حقائق کو بیان کیا تھا۔اس معاملہ میں ان کا پرچم میں نے آج تک اُٹھا رکھا ہے۔تاہم مجھے امید ہے کہ اپنے حالیہ دورۂ یورپ کی جملہ تقریبات کو بھگتنے کے بعد وہ اپنے سابقہ موقف کو ایک بار پھر یورپی تناظر میں ضرور تحریر کریں گے۔تب اندازہ ہوگا کہ ان کے نزدیک صورتحال پہلے سے زیادہ تشویشناک ہوگئی ہے یا بہتر ہوئی ہے۔ماہیا کی ثقافتی پہچان کے سلسلہ میں ستیہ پال آنند جی سے ایک بار سہو ہوگیا تھا،ہم نے مناسب طور پر نشان دہی کر دی تھی اور بات وہیں ختم ہوگئی۔نثر میں لکھی ہوئی ستیہ پال آنند جی کی مختلف تحریریں اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں،وہ رپورتاژ کی صورت میں ہوں یا یادوں کی صورت میں۔مضامین کی صورت میں ہوں یا تاثرات کی صورت میں۔میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ایک بار میرے اردو افسانوں پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا لیکن افسوس کہ پھر ان سے اپنی لکھی ہوئی تحریر کہیں کھوگئی جو آج تک انہیں مل نہیں پائی۔آنند جی نے افسانہ نگاری بھی کی ہے،تین چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں،پہلا مجموعہ تب چھپا تھا جب میں ایک سال کا تھا۔حال ہی میں ’’میرے منتخب افسانے‘‘ کے نام سے ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے جس سے بحیثیت افسانہ نگار ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔شروع میں غزل بھی کہی اور ان کی غزل کے چند یادگار نقوش ادبی رسائل میں محفوظ ہیں۔ستیہ پال آنند جی کی نظم کے سلسلہ میں میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔تاہم یہ حقیقت ہے کہ جدید نظم کی معتبر ترین روایت کے حوالے سے آنند جی کا شمار اہم ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔آج کے زندہ شعراء کی آٹھ دس اہم ترین نظم نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں ان کا نام لازماً شامل رہے گا۔ستیہ پال آنند جی ادبی سچائی کو محترم سمجھتے ہیں لیکن اس کے اظہار میں احتیاط کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔

اتنا سچ بول کہ ہونٹوں کا تبسم نہ بجھے
روشنی ختم نہ کر، آگے اندھیرا ہوگا

بے لاگ سچ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن حکمت و فراست والا ان کا خاص رویہ بھی بری بات نہیں۔ اگرچہ زیادہ احتیاط میں بے احتیاطی بھی ہو جاتی ہے۔یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم سب نہ

صرف ڈاکٹر ستیہ پال آنند جی جیسی علمی و ادبی شخصیت سے ملنے کے لیے جمع ہوئے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہمیں صدف مرزا اور باقر رضا زیدی جیسے احباب سے بھی ملنے کا موقعہ مل رہا ہے۔اور ہم سب کو مل بیٹھنے کا بہانہ مل گیا ہے۔میں اس تقریب میں آنے پر تمام شرکاء کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ہائیڈل برگ سے اقبال چیئر کے پروفیسر ڈاکٹر وقار شاہ صاحب،افغانستان کے شیریں دل گردی وال صاحب،فرید برگ سے راجہ محمد یوسف صاحب، اوفن باخ سے طاہر عدیم صاحب،سجاول صاحب اور محمد افضل صاحب،بون سے امتہ المنان طاہرہ صاحبہ، عاطف توقیر صاحب،بریمن سے علینہ (Alena) صاحبہ،فرینکفرٹ سے عرفان خان صاحب، ہائیڈل برگ سے ڈاکٹر ہنس ہارڈر (Hans Harder) صاحب،ڈاکٹر وسیم احمد طاہر صاحب،شہزادار مان صاحب ،ارم بتول صاحبہ اور زیب النساء صاحبہ،من ہائم سے نوید ظفر صاحب اور قرۃ العین صاحبہ،پاکستان سے آئے ہوئے دوست جعفر رضا صاحب اور برلن سے ہندی کویتا اور غزل کے ملاپ جیسی انوکھی شاعری کرنے والے دوست جتیندر ردت صاحب،ہمبرگ سے طاہرہ رباب صاحبہ،ان سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ آپ سب شرکاء مہمانانِ خصوصی بھی ہیں اور میزبان بھی۔یہ ادب کا ذوق رکھنے والوں اور ادبی برادری کے مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے۔

اب پہلے مرحلہ میں شعرائے کرام سے کلام سنا جائے گا،دوسرے مرحلہ میں ڈاکٹر وقار شاہ صاحب اظہار خیال فرمائیں گے۔پھر مہمانانِ خصوصی اور خاص طور پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند جی کے ساتھ سوال و جواب کی صورت مکالمہ ہوگا،جس کا مقصد مہمانوں کو علمی اور تخلیقی طور پر مزید جاننا ہو گا۔اور آخر میں صاحبِ صدر کے اختتامی کلمات کے ساتھ محفل اختتام پذیر ہوگی۔تقریب کے بعد کھانے پینے کا انتظام ہے۔

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی شمارہ ۱۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء)

ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے شعبہ جنوبی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ میں
ڈاکٹر ستیہ پال آنند،صدف مرزااور باقر رضا زیدی کے اعزاز میں تقریب

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیرِ صدارت ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ میں ایک پُر وقار ادبی تقریب ہوئی۔اس تقریب میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند(امریکہ)،صدف مرزا(ڈنمارک) اور باقر رضا زیدی(پاکستان) مہمانانِ خصوصی تھے۔حیدر قریشی نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔آغاز میں حیدر قریشی نے ایک مضمون کی صورت میں مہمانانِ خصوصی اور جملہ شرکاء کا خیر مقدم کیا۔اس کے بعد مشاعرے کا دور ہوا جس میں جیتندر دت(برلن)،ارم بتول(ہائیڈل برگ)،عاطف توقیر (بون)،شہزاد ارمان(ہائیڈل برگ)،طاہرہ رباب(ہمبرگ)،راجہ محمد یوسف(فرید برگ)،طاہر عدیم (اوفن باخ) اور مہمانانِ خصوصی باقر رضا زیدی،صدف مرزا اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے ان کا کلام سنا گیا۔شعرائے کرام نے عمدگی سے اپنا کلام پیش کیا اور حاضرین نے مناسب طور پر داددی۔مشاعرے کے دور کے بعد یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے پروفیسر ڈاکٹر وقار علی شاہ نے اظہار خیال کیا۔انہوں نے اقبال کی شاعری میں اُس زمانے کے افغانستان کا ذکر کیا اور پھر آج کے افغانستان اور پاکستان کے پختون علاقوں تک کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اقبال کے زمانے سے بھی زیادہ تشویشناک ہو چکی ہے۔اس تقریر کے بعد کھانے اور چائے کا وقفہ دیا گیا۔

وقفہ کے بعد مہمانانِ خصوصی کے ساتھ اور خاص طور پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب کے ساتھ ادبی مکالمہ کا موقعہ فراہم کیا گیا۔تاہم اپنی عمر اور مسلسل سفر کی تکان کے باعث وہ یکسو نہیں

رہ پائے تھے۔حاضرین کی طرف سے میڈیا کی اثر آفرینی اور ادب کے معاملہ میں لاتعلقی کے حوالے سے سوال کیا گیا لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اردو کی ابتدا کیسے ہوئی کے موضوع کی طرف نکل گئے۔صدف مرزا نے اس موقعہ پر اصل موضوع پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس کا مناسب جواب دیا اور ڈاکٹر کرسٹینا نے مغرب میں بھی ادب اور میڈیا کے رشتے میں لگ بھگ ایک جیسی صورتحال کی نشان دہی کی۔راجہ محمد یوسف کی طرف سے ایک سوال کے جواب میں عروض کی بحث چھڑنے لگی۔راجہ یوسف نے "تسکینِ اوسط" کہا تو ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کہا کہ س پر زبر نہیں ہے،جزم ہے۔راجہ یوسف نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند مسلسل سفر کی تکان کے باعث غلط تلفظ بتا رہے ہیں،بحث پر اصرار کرنے کی بجائے مہمانِ خصوصی کے احترام میں خاموشی اختیار کر لی۔اس مکالماتی حصہ کو صدف مرزا کی دانشمندانہ گفتگو اور باقر رضا زیدی کی شرکت نے زیادہ با معنی بنایا۔دیگر شرکائے گفتگو میں ارم بتول،راجہ یوسف،توقیر عاطف،شہزاد ارمان،ڈاکٹر وسیم احمد طاہر اور طاہر عدیم سرگرم رہے۔

حیدر قریشی نے ڈاکٹر کرسٹینا کے تعاون کا خصوصی شکریہ ادا کیا،راجہ محمد یوسف،طاہر عدیم،اور بطور خاص "اہلِ قلم" کے شہزاد ارمان اور ارم بتول کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون کے باعث یہ تقریب نہایت پر وقار اور کامیاب رہی۔آخر میں تقریب کی صدر ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے اس تقریب کی کامیابی کا تمام تر کریڈٹ حیدر قریشی کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ نہایت کامیاب تقریب ہمارے لیے بہت خوشی کا باعث ہے۔آئندہ بھی جب حیدر قریشی اس انداز کی تقریب کرنا چاہیں ہماری طرف سے بھرپور تعاون شامل رہے گا اور ہمارے اردو کے جرمن نژاد طلبہ اس میں بھرپور شرکت کریں گے۔

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی شمارہ ۱۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے لاگ اور لگاؤ

ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے میرا تعلق لاگ اور لگاؤ دونوں طرح کا ہے۔ادبی رسائل میں تو انہیں ایک عرصہ سے پڑھ رہا تھا لیکن ان سے ادبی ربط میں اس وقت غائبانہ گہرائی آئی جب ان کے دو مختلف رویوں نے توجہ کھینچی۔ پہلا رویہ لاگ کا تھا۔ستیہ پال آنند نظمیں کہتے ہیں لیکن غزل کو ہدفِ تنقید بنائے رکھتے ہیں۔اس لاگ میں لگاؤ کا پہلو یوں ہے کہ غزل میں پیش پا افتادہ مضامین کی تکرار سے بچنے /بچانے کے لیے ایسی تنقید ہوتی رہنی چاہیے تاکہ غزل میں صحت مند بہتری آسکے۔تاہم بنیادی مسئلہ لاگ والا ہی تھا کہ ستیہ پال آنند کمزور یا بری غزل لکھنے والوں سے تنگ آکر پوری اردو غزل ہی کو دریا برد کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ یہ رویہ غزل کے تاریخی اور مضبوط ترین ادبی کردار کے معترفین کے لیے بہرحال افسوسناک ہے۔دوسرا رویہ ان کا ایک معرکتہ الآراء مضمون تھا جو دہلی کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔اس میں ستیہ پال آنند نے مغربی دنیا میں مشاعروں کی منفی صورتحال کو اجاگر کرنے کے ساتھ سُر اور ناز و ادا کے ساتھ کلام سنانے والی ”شاعرات“ کے لیے ”مجرا“ جیسا لفظ بھی استعمال کیا تھا اور مغربی دنیا کی ادبی تقریبات میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں اعداد و شمار کے ساتھ حقائق بیان کیے تھے۔شرکاء کی بھاری اکثریت علمی و ادبی معلومات نہیں رکھتی تھی۔ ستیہ پال آنند کی پیش کردہ بہت ساری مثالوں میں سے صرف ایک مثال یہاں دوں گا کہ کشور ناہید کے بارے میں پوچھے جانے پر ”ادب کا ذوق رکھنے والے“ شرکاء نے انہیں گلوکارہ قرار دیا (یعنی کشور ناہید کے نام سے گلوکارہ ناہید اختر کے نام کے مغالطہ کا شکار ہوئے)۔ یہ ہمارے گہرے لگاؤ کی بات تھی۔لیکن ستیہ پال آنند نے اس میں

لاگ نمایاں کر دیا۔میں آج تک ستیہ پال آنند والے اُسی موقف پر قائم ہوں اور اس کے لیے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں، جسے میں نے ستیہ پال آنند سے سیکھا تھا لیکن ستیہ پال آنند اپنے اس موقف سے عملی طور پر منحرف ہو چکے ہیں۔احمد فراز اور دوسرے پاپولر شعراء پر ستیہ پال آنند ہمیشہ یہ اعتراض کرتے رہے کہ وہ ادب سے بالکل بے بہرہ خواتین کے جمگھٹے میں گھرے رہنے کو اپنی ادبی مقبولیت شمار کرتے ہیں۔لیکن افسوس کہ کہیں انہیں احمد فراز جیسے انداز کی سو فی صد نہ سہی پانچ سات فی صد بھی ایسی سہولت میسر آئی تو آپ بھی ویسے ہی اسے ادب کی ترویج اور اپنی ادبی مقبولیت شمار کرنے لگے۔اور آپ کا لکھا ہوا سارا حق، سچ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ایک طرف عمدہ غزل کہنے والوں کو بھی غزل کے شاعر شمار کر کے ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسری طرف بالکل بے وزن شاعرات کی غزلوں پر نہ صرف اصلاح دی جاتی ہے بلکہ کتاب کی اشاعت کے بغیر کتاب کی جعلی تقریب رونمائی جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس کا میں اشارا دے رہا ہوں۔تاہم میں نے جس لاگ اور لگاؤ کی بات کی ہے وہ کسی ایک واقعہ سے منسلک نہیں ہے بلکہ میرا لکھا ہوا ایک عرصہ سے آن ریکارڈ آ رہا ہے۔بطور ثبوت چند خاص مثالیں پیش ہیں

☆ میرا مضمون ”غزل بمقابلہ نظم“ سہ ماہی شعر و سخن مانسہرہ کے غزل نمبر میں شائع ہوا تھا (۱)۔اس مضمون میں ستیہ پال آنند کے ماہنامہ شاعر ممبئی میں چھپے ایک مضمون کا مدلل جواب دیا گیا تھا اور براہِ راست ستیہ پال آنند کا نام بھی نہیں لیا گیا تھا لیکن روئے سخن از خود ظاہر تھا۔

اس کے علاوہ میری چند اور تحریروں میں یہ لاگ اور لگاؤ ان کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے۔ چند اقتباسات حوالوں کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

☆ ”ان دنوں میں ستیہ پال آنند غزل کی مخالفت میں کھاتے کھتونیاں کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں۔غزل کا سب سے بڑا عیب اور کمال یہ ہے کہ اس میں کسی کے خیال سے استفادہ کرنے والا یا سرقہ کرنے والا چھپ نہیں سکتا۔جبکہ نظم اور خاص طور پر جدید تر نظم میں اتنا گورکھ دھندا ہوتا ہے کہ

عام طور پر نظم نگار کی کاری گری کی طرف دھیان ہی نہیں جا پاتا۔ چونکہ جناب ستیہ پال آنند غزل کی مخالفت کر کے اپنی نظمیں کہہ رہے ہیں اس لیے ان کی ایک نظم اور ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نظم کے چند اقتباس بطور ایکسرے رپورٹ پیشِ خدمت ہیں:

ستیہ پال آنند کی نظم ''دھرتی پران''

(مطبوعہ: ماہنامہ کتاب نمائی دہلی۔شمارہ جون ۱۹۹۹ء)

چاند کی بڑھیا اونگھ گئی کچھ دیر کو،لیکن جب جاگی تو اس نے دیکھا،دھرتی بالکل بدل گئی تھی۔۔۔۔سبز گھنے جنگل، نیلے ساگر،ندیاں نالے،جھیلیں، برفانی تودے،جھر جھر کرتے فواروں سے ابل ابل کر گرتے جھرنے،گھاس ،جھاڑیاں،دور تلک پھیلے میدانوں میں چرتے آزاد مویشی، پنکھ پکھیرو اور دو پائے، چونک گئی کچھ، کچھ گھبرائی چاند کی بڑھیا!۔۔۔وہ آڑی ترچھی، بے ہنگم سی ریکھائیں، جو دھرتی کے بیٹے مل کر سرحد سرحد کھینچ رہے تھے۔دھرتی کے سینے کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹ رہے تھے۔۔۔۔بڑے بڑے ٹکڑے دھرتی کے،جن میں لاکھوں لوگ، قبیلے،نسل،رنگ اور قومیت کی بنیادوں پر اپنی ماں کو بانٹ رہے تھے۔۔۔۔۔یہ کیسا طوفان تھا، جو اک چھتری کی مانند ہوا میں اونچا اُٹھتا،کھنب کی صورت دھرتی کے سینے سے اُبھرتا،شعلوں میں ملبوس کسی راون سا جلتا،میلوں اونچا، دور خلا تک اس کی جانب لپک رہا تھا!

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم ''اک کتھا انوکھی''(مطبوعہ ۱۹۹۰ء)

اک جنگل تھا/گھنی گھنیری جھاڑیوں والا/بہت پرانا جنگل/جس کے اندر اک کٹیا میں/اپنے بدن کی چھال میں لپٹا/اپنی کھال کے اندر گم صُم/جانے کب سے/کتنے جگوں سے/پھٹے پرانے چوغے پہنے/وہ اک خستہ بیج کی صورت/بے سُدھ/بے آواز پڑا تھا!/۔۔۔''اب تو اُٹھ جا/آخری جُگ بھی بیت چکا/سورج میں کالک اُگ آئی/چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا/دیکھ کہ گھاس جلی جھلسی ہے/ندیوں میں جل سوکھ گیا۔۔۔۔ اُس کے لب پر/جاگ اُٹھی مُسکان رَسیلی/بوجھل

پلکوں کی درزوں سے/جھانکا/اُس کے من کا اُجالا/اُس نے جیسے/کروٹ لی ہے/اور پوچھا ہے:/کہاں ہوں میں ؟ کیا سَمے ہوا ہے؟؟/۔۔۔۔یہ سب/نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!/ساگر جس نے/ان کیڑوں کو جنم دیا تھا/اب اک گندا جوہڑ بن کر/ان کے اندر کے جوہڑ سے/آن ملا ہے/ساگر کا ایمان ہوا ہے/ساگر ماں ہے/ماں ہتھیا/اس کلجُگ کا ایمان ہوا ہے!/۔۔۔اور اب۔۔یہ سب/گندے کیڑے/جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں/جنگل جس نے کتنا ان سے/پیار کیا تھا/۔۔۔آج وہی طوفان/نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے/لیکن اب کی بار یہ طوفاں/اگنی کا ہے/جلے ہوئے کیسر کے ڈنٹھل/شعلوں کے گرداب/ہوا کا شور/گھنے بادل کے تن پر/دھڑ دھڑ پڑتے/آگ کے ذُرّے/ایک عجب کہرام بپا ہے/۔۔۔۔

وزیر آغا نے انسان کے اندر اور باہر کو دو کردار بنا کر بات کی تھی،آنند صاحب نے چاند کی بڑھیا کو بیچ میں ڈال دیا ہے۔آنند صاحب کی اس نظم کے مزید ایکسرے بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن پہلے اس ایکسرے سے تشخیص ہو جائے'' (ادبی خبر نامہ ''اردو دنیا'' جرمنی شمارہ نومبر ۱۹۹۹ء)

یہ ویسا ہی توارد ہے جیسا غزل کے مضامین میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔مزید ایکسرے کی صورت میں مزید مثالیں بھی سامنے لائی جا سکتی ہیں۔

☆ ''اسی شمارہ میں (اوراق شمارہ جولائی اگست ۱۹۹۹ء میں) علی محمد فرشی کے ماہیا نما ثلاثی کے مجموعہ ''دکھ لال پرندہ ہے'' پر ستیہ پال آنند کا مضمون شائع ہوا۔اردو ماہیے کی تحریک کے نتیجہ میں اب اگر مہاراشٹر، بہار یا راجستھان کے کسی ادیب سے بھی پوچھا جائے تو وہ پنجابی ماہیے کے بارے میں اتنی بات تو آسانی سے بتا دے گا کہ پنجابی ماہیے میں عمومی طور پر عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' میں اس کے سرے ہندی گیت کی قدیم روایت سے بھی جوڑے تھے لیکن ستیہ پال آنند نے اپنے مضمون میں اسے ہندی گیت کی ''روایت کے برعکس'' لکھتے ہوئے ''مرد کی طرزِ سخن'' قرار دیا ہے جو علمی لحاظ سے حیران کن بات ہے۔''

مضمون ''اوراق اور ماہیا'' **(مطبوعہ ''اوراق'' لاہور خاص نمبر،جنوری۔فروری 2000ء)**

☆**ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں** (تجزیاتی مطالعہ) **مرتّب**: **بلراج کومل**

صفحات: 256 **قیمت**: 180 **روپے** **ناشر**: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی

”جدید نظموں کے مطالعہ کا رواج جدید تنقید کے زیرِ اثر شروع ہوا تھا۔قارئین کو نظم کی سمجھ نہیں آتی تھی سو اس مطالعاتی سلسلہ نے قاری کے لیے کچھ سہولت پیدا کر دی اور نکتہ آفرینی کی صورت بھی بن گئی۔مابعد جدیدیت نے اس نکتہ آفرینی کو رومال یا ٹوپی میں سے کبوتر نکال کر دکھانے کا کھیل بنا دیا۔اب مابعد جدیدیت کا گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں جو انجام ہو چکا وہ علمی سطح پر عبرت کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔(مجلسی سطح پر نارنگ صاحب جتنا چاہے اپنا جی بہلا لیں، پر جتنا ہو چکا، بڑا عبرتناک ہے) میرا جی اور راشد کے زمانے کے بعد سے اب تک جدید نظم فہمی کا سلسلہ اتنا ہو جانا چاہیے تھا کہ نظم کا قاری خود اس سے لطف اندوز ہو سکے۔لیکن نظم کے تجزیاتی مطالعہ کے نام پر مضامین کا جو سلسلہ جاری ہے اس سے ایسا لگتا ہے جیسے نظم کے ساتھ ’ترکیب استعمال‘ کا پرچہ لف کیا جا رہا ہو۔میں نے ستیہ پال آنند کی تیس نظموں کو پڑھ کر زیادہ لطف اُٹھایا ہے اور یہ نظمیں ایسی ہیں کہ نظم کے قاری کے لیے غیر ضروری مشکل پیدا نہیں کرتیں۔جن دوستوں نے نظموں کا تجزیہ/مطالعہ کیا ہے ان کا ستیہ پال آنند کے تئیں اخلاص برحق ہے لیکن شاید یہ دوسرے قارئین کی آزاد اقرأت میں روک بھی پیدا کرتے ہیں۔بہرحال جو کام خلوص سے کیا جائے اس کی قدر کی جانی چاہیے،بس اس بنیاد پر ایسے تجزیاتی مطالعات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔توقع کی جانی چاہئے کہ یہ کتاب ستیہ پال آنند کی نظموں کی تفہیم میں عام قارئین کے لیے کسی نہ کسی طور ممد و معاون ثابت ہوگی۔(جدید ادب جرمنی۔جنوری تا جون ۲۰۰۹ء۔شمارہ نمبر۱۲)

میرے اس انداز کے کھلے تبصروں پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کبھی قطع تعلق نہیں کیا۔بلکہ ایسا لکھنے پر ہر بار رابطہ بحال رکھا۔اپنی تخلیقات سے نوازتے رہے۔جب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقات کی بات چلی تو اس بحث میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا عمومی رویہ ہماری حوصلہ افزائی کرنے والا تھا لیکن پھر پتہ نہیں کس مجبوری کے تحت یا کس کے اشارے پر انہوں نے اس پنگے میں ٹانگ پھنسا

لی۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اس بحث کی زد میں آ گئے۔مجھے ستیہ پال آنند کی ایک مجبوری کا علم ہوا تو میں نے صرف سرقہ والے معاملہ کے اخلاقی حوالے تک ان کی گرفت کی لیکن ان کی مجبوری والے پہلو کو جاننے کے بعد خاموش رہنا مناسب سمجھا۔اس اشو کی آن ریکارڈ باتیں مضمون ”ڈاکٹر نارنگ کے سرقوں کے دفاع کی مہم۔اتفاقیہ یا منصوبہ بند کاروائی؟“ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔(۲)

☆ ”اس سال فروری کے مہینے میں امریکہ سے ستیہ پال آنند کی ای میل آئی کہ میں یورپ کا سفر کرنے والا ہوں۔ان کے ساتھ گزشتہ برس ایک علمی مجادلہ میں ہلکی سی تلخی ہوئی تھی۔میں نے جوابی کاروائی میں ان کی متعلقہ ای میلز شائع کر کے انہیں علمی و اخلاقی دونوں سطح پر خاموش کر دیا تھا۔یہ ساری روداد میری کتاب ”ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت“ میں محفوظ ہے۔اس سب کچھ کے باوجود ان کی ای میل آئی تو کچھ اچھا سا لگا۔سو میں نے انہیں لکھا کہ جب یورپ آ رہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔ڈاکٹر آنند فوراً راضی ہو گئے۔مجلسی سرگرمیوں سے تمام تر بے رغبتی کے باوجود اب مجھے ایک تقریب کا اہتمام تو کرنا تھا۔۔۔۔چنانچہ ۲۴ مارچ کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیرِ صدارت ڈاکٹر آنند کے اعزاز میں تقریب کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔تقریب کے بعد ڈاکٹر آنند کوئی رسمی شکریہ کہنا تو کجا، مجھے خدا حافظ کہے بغیر روانہ ہو گئے۔اگلے روز انہوں نے ہمبرگ میں کسی خاتون کی شاعری کی ایسی کتاب کی تقریب رونمائی کرنی تھی جو شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔۲۳ مارچ کی رات جب ڈاکٹر آنند میرے ہاں مقیم تھے وہ دیر تک اس خاتون کی شاعری کے مسودے پر اصلاح کا نیک فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔میں نے تب ہی انہیں دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ کتاب کی اشاعت کے بغیر رونمائی کے ڈرامہ میں شریک ہوئے تو وہ ایک ادبی جرم کے مرتکب ہوں گے۔لیکن انہیں اس تقریب میں شرکت کی جلدی تھی سو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی ملے بغیر چلے گئے۔امریکہ واپس پہنچنے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی رسمی ای میل تک نہیں ملی۔شاید یہ ادبی تہذیب کا کوئی مابعد جدید رویہ ہو۔“

(یادوں کا باب "زندگی در زندگی" از حیدر قریشی۔۔۔مطبوعہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔شمارہ نمبر۱۲
۔اگست ۲۰۱۰ء۔۔۔۔۔جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر۱۶۔جنوری ۲۰۱۱ء)

یہ سارے حوالہ جات ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے ساتھ میرے لاگ اور لگاؤ دونوں کا ثبوت ہیں۔ایسا لاگ اور ایسا لگاؤ جس میں دو دہائیوں سے ایک تسلسل موجود ہے۔

انہوں نے ایک بار مجھے اپنی ایک پرانی غزل عنایت کی تھی۔

بھرے پرے میلے میں گئے تھے کس کے سہارے بھول گئے
کس کی انگلی مٹھی میں تھی ہم بے چارے بھول گئے

ہر چند اس غزل کو پڑھتے ہی میرا جی کی غزل "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا" یاد آتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ستیہ پال آنند نے غزل کی مخالفت کرنے کا رستہ اختیار کرنے کی بجائے اپنی غزل کے سفر کو جاری رکھا ہوتا تو شاید غزل کے وہ امکانات کھل کر سامنے آجاتے جو میرا جی کی غزل میں موجود تھے لیکن ان کی غزل سے عدم توجہی کے باعث کھل کر سامنے نہ آ سکے۔ بلاشبہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند جدید نظم کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔ان کے افسانے ایک عرصہ سے چھپ رہے ہیں لیکن ناقدین رقارئین نے افسانوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔حال ہی میں ان کے افسانوں کا ایک انتخاب "میرے منتخب افسانے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔یہ افسانے ۱۹۴۹ء سے لکھے جا رہے تھے، سوا اپنے اسلوب کے اعتبار سے ان پر اُس زمانے کی چھاپ کا ہونا لازم تھا۔ڈاکٹر آنند کے افسانے سادہ بیانیہ پر مشتمل ہیں تاہم ان میں سے بعض افسانے بے حد پُر تاثیر ہیں۔"میرا نام انجم ہے" تو ایسا زبردست افسانہ ہے جسے منٹو کے "کھول دو" کے برابر رکھا جانا چاہیے۔ان کے افسانوں میں ایک کمی کا احساس ہوتا ہے کہ وہ جیسے تدریجاً جدید نظم کی طرف آتے گئے اس طرح جدید افسانے کی طرف نہیں آ سکے۔تجرباتی طور پر سہی ان کے دو چار افسانے تو ایسے ہونے چاہئیں تھے۔سو ایک ہی تخلیق کار کے ہاں نظم اور افسانے میں جدید اور روایتی بیانیہ کا جو گہرا فرق ہے، وہ بہر حال کھلتا ہے۔اس کے باوجود بحیثیت

تخلیق کار ڈاکٹر ستیہ پال آنند ایک عمدہ تخلیق کار ہیں(۱)۔میں ان کی تخلیقی کامیابیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

ادبی دنیا میں اصولوں کے نام پر کہنا کچھ اور کرنا کچھ۔۔۔ان کی انسانی کمزوریاں ہیں۔تاہم مجھے خوشی ہے کہ وہ مشاعرہ بازی، تقریباتی رنگ بازی اور ادب میں (متشاعر ٹائپ) خواتین کے کردار کے حوالے سے اپنی بیان کردہ جن باتوں کو چھوڑ گئے ہیں، میں آج بھی اُن پر قائم ہوں۔اور ان کے مضمون کے ذریعے ان کا سکھایا ہوا سبق آج خود انہیں یاد دلا رہا ہوں!

لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اپنی لکھی باتیں بھُولے نہیں ہیں، جنہیں سب کچھ یاد ہو انہیں یاد دلانے کا فائدہ؟۔۔۔۔یاد دلانے کا کوئی فائدہ نہیں تو کچھ احساس ہی دلا دیا جائے۔

یہ مضمون احساس دلانے کی ایک کاوش ہے۔

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے تری بات!

(مطبوعہ روزنامہ ہمارا مقصد دہلی شمارہ:۶رستمبر۲۰۱۰ء)

(۱) میرے بعد کے مضامین سے ظاہر ہوتا گیا کہ ان کی "تخلیق کاری" میں اکتساب، استفادہ سے ہوتے ہوئے سرقہ تک کا سفر طے ہوا ہے۔سو میں ان کی ساری کاری گری کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔(ح۔ق)

اردو غزل کا انتقام

ستیہ پال آنند صاحب کا انجام

ستیہ پال آنند صاحب کی ایک ویڈیو ان دنوں موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ یہ امریکہ میں ہونے والے ایک کوی سمیلن کی ویڈیو ہے جس میں انہوں نے غلام محمد قاصر کے دو شعر بڑے مزے سے اپنے کلام کے طور پر سنا دیئے ہیں۔ یہ ویڈیو اس لنک پر دیکھی اور سنی جا سکتی ہے۔

http://www.youtube.com/watch?v=bVXI0WWcv6g

بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

ستیہ پال آنند صاحب کی اس کاروائی کا ناصر علی سید صاحب نے اپنے کالم میں ذکر کرتے ہوئے غلام محمد قاصر مرحوم کے بیٹے کی ای میل درج کی اور لکھا:

”ناصر انکل، ستیہ پال آنند جی کو والد صاحب کے اشعار پڑھتا دیکھ کر حیرت ہوئی، والد گرامی سے ان کی ملاقاتیں بھی ہیں اور خط و کتابت بھی رہی۔ یہ ان کا نام لے کر پڑھتے تو خوشی ہوتی کہ انہوں نے اپنے دوست کو یاد رکھا ہوا ہے۔ یہ اشعار ۱۹۹۷ میں شائع ہونے والے ان کے مجموعے کے فلیپ پر موجود ہیں جب کہ اگست ۱۹۹۶ کے پی ٹی وی کے مشاعرے کا لنک میں بھیج رہا ہوں۔ جس میں ان کی اپنی آواز میں یہ غزل سنی جا سکتی ہے۔“

خیر اس کے لئے تو عماد جی کسی گواہ کی ضرورت نہیں کہ یہ شعر خود ہی غلام محمد قاصر کا نام لیتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اب اس ستم ظریفی کو دیکھئے اس کوی سیمیلن میں غزل کے شعر وہ سنا رہا ہے جس کی وجہ شہرت ہی غزل دشمنی ہے۔ (روزنامہ آج پشاور۔30/ستمبر 2011ء کا ادبی ایڈیشن)

ستیہ پال آنند کو مذکورہ ویڈیو کا لنک بھیجتے ہوئے میں نے حقیقت حال جاننا چاہی تو ان کی طرف سے ایک وضاحت ۲۵ ستمبر ۲۰۱۱ء کو موصول ہوئی۔ وہ وضاحت آگے چل کر درج کروں گا۔ پہلے یہاں ان کی وہ وضاحت درج کرتا ہوں جو انہوں نے 15/نومبر 2011ء کو ایک انٹرنیٹ فورم بزمِ قلم سے جاری کی ہے۔

From: spanand786@hotmail.com
To: bazmeqalam@googlegroups.com
Subject: {7217} Charge against me.
Date: Tue, 15 Nov 2011 17:09:05 -0500

Someone has posted a video that shows me reciting my dear old friend Ghulam Mohammad Qasir's couplets. The purpose is to show that I have recited his couplets in my own name. I want to make this matter clear.

This video has been tempered with. I was presiding over a function for the release of a Hindi book of poetry by Rakesh Khandelwal.The function was held in Durga Temple in Virginia. When I had finished my presidential speech, the audience asked me to recite from memory some couplets. They know only Hindi and but they always enjoy Urdu ghazal couplets. I am personally not much enamored of Ghazal but I keep them in good humor always. I recited some of own poems as also some ghazal couplets. But before reciting some of these couplets I said these were from an old friend from Peshawar, Mr. G.M. Qasir. It seems some one (I know it is a particular person from Germany, who is fond of such pranks) has tempered with the video. I have watched it carefully. It starts suddenly, as if just one second before, there was something and it has been cut off from the tape and my voice is heard. I remember, i had told the audience that my childhood was spent in Peshawar and I have dozens of friends there and I recited some couplets from Faraz, Mohsin Ehsan, Khatir Ghaznavi, Zahur Eiwan and Ghulam Mohammad Qasir. Alas, all of them are now no more. I have been left alone to face such silly and mischievous pranks.

Satyapal Anand

اس وضاحت پر ناصر علی سید صاحب نے فوراً ستیہ پال آنند کو مخاطب کر کے یہ ای میل ریلیز کی:

From: nasiralisyed@hotmail.com

To: bazmeqalam@googlegroups.com

Subject: RE: {7217} Charge against me.

Date: Wed, 16 Nov 2011 12:08:15 +0500

satiya jee, salam.....i hvnt heared any shair of zahoor awan...will u plz send me some of the couplets....u recite in taqreeb.

ستیہ پال آنند صاحب نے اردو کلام سنایا تھا،اردو کے مختلف فورمز پر غلام محمد قاصر کے دو اشعار اپنے نام سے سنا دینے کا چرچا ہو رہا تھا۔اگر کسی وضاحت کی ضرورت محسوس کر لی تھی تو کیا انگریزی میں وضاحت کرنا ضروری تھا؟۔۔۔جبکہ آنند صاحب کے پاس اردو ای میلز لکھنے کی سہولت موجود ہے اور وہ عمومی طور پر انٹرنیٹ کے ذریعے احباب سے اردو میں ہی مراسلت کرتے ہیں۔

انگریزی میں لکھے گئے ستیہ پال آنند صاحب کے اس وضاحت نامے کے مطابق:

۱۔"ورجینیا کے درگا مندر" میں یہ کوی سمیلن ہوا تھا۔

۲۔اس میں انہوں نے غلام محمد قاصر کا نام لے کر بتایا تھا کہ یہ اشعار ان کے ہیں۔

۳۔اس ویڈیو کو ٹیمپر کیا گیا ہے اور اس میں جرمنی کا ایک بندہ ملوث ہے۔(روئے سخن غالباً میری طرف ہے)

۴۔میں نے حاضرین کو بتایا تھا کہ میرا بچپن پشاور میں گزرا تھا وہاں میرے درجنوں دوست تھے۔ فراز،محسن احسان،خاطر غزنوی،ظہور اعوان اور غلام محمد قاصر،میں نے ان دوستوں کے نام لے کر چند اشعار سنائے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مندر میں ہونے والے کوی سمیلن میں ستیہ پال آنند کو اطمینان تھا کہ یہاں کوئی اردو جاننے والا نہیں ہے۔حاضرین میں دیویوں کی کثرت دیکھ کر دل نے غزل کا سہارا لیا اور انہوں نے ایک معصومانہ انداز میں دوسرے کا کلام اپنے نام سے سنا دیا۔اس میں ایک تسلسل بھی موجود ہے۔"مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا" کے فوراً بعد انہوں نے اپنا کلام شروع کر

دیا"سانپ سے خوف اب نہیں آتا"۔۔۔۔غزل کی داد اسی روانی میں چلتی گئی،اچھی مشاعراتی تیکنیک ہے۔بہر حال یہ ایک معصوم سی لغزش تھی جسے اب بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن ستیہ پال آنند ایک معصوم لغزش کو چھپانے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔انہوں نے ہرگز ہرگز غلام محمد قاصر کا نام لے کر شعر نہیں سنائے تھے۔اس کا ثبوت ان کی ایک میل سے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے مجھے ۲۵ ستمبر کو بھیجی تھی:

"اس کوی سمیلن میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ اپنی نظموں کے علاوہ اردو کے مشہور شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار سنائیں۔مجھے کچھ اشعار یاد تھے وہ میں نے سنا دیئے۔شعراء کے نام نہیں واضح کیے گئے۔کیونکہ یاد نہیں تھے۔آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود غزل نہیں کہتا۔اور میں نے کبھی کوئی غزل کسی مشاعرے میں نہیں پڑھی۔"(ستیہ پال آنند کی ای میل بنام حیدر قریشی۔۲۵ ستمبر ۲۰۱۱ء)

اس ای میل میں ستیہ پال آنند اعتراف کر رہے ہیں کہ شعراء کے نام یاد نہیں تھے اس لیے واضح نہیں کیے۔جبکہ اب ۱۵ نومبر کی وضاحت میں لکھتے ہیں انہوں نے غلام محمد قاصر ہی کا نہیں فراز،محسن احسان،خاطر غزنوی،ظہور اعوان کا نام بھی لیا تھا اور ان کے اشعار بھی سنائے تھے۔بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو بھی شاعر کے طور پر نہ صرف بیان کیا بلکہ ان کے شعر بھی سنا دیئے۔یہ ہوتی ہے "بیان ٹمپرنگ" اسے سفید جھوٹ کہا جاتا ہے۔

ویڈیو ٹمپرنگ کے الزام میں چونکہ ستیہ پال آنند صاحب نے مجھے گھسیٹ لیا ہے اس لیے اس کی بھی کھل کر بلکہ کھول کر وضاحت کر دوں۔یوٹیوب پر اسے اپ لوڈ کرنے والے کا آئی ڈی helloanoop ہے۔ان کا چینل ایڈریس یہ ہے:

http://www.youtube.com/user/helloanoop

ابھی تک یہاں ۲۲ ویڈیوز اپ لوڈ کی گئی ہیں۔انوپ صاحب کا پورا نام انوپ بھارگوا ہے۔یہ امریکہ میں مقیم ہیں۔۲۲ میں سے چند ویڈیوز کو چھوڑ کر زیادہ تر درگا مندر کے کوی سمیلن کی ویڈیوز ہیں۔ان میں انوپ بھارگوا صاحب خود بھی کویتائیں سنا رہے ہیں۔یہ ویڈیوز آج کل میں

اپ لوڈ نہیں کی گئیں بلکہ 2008ء میں اپ لوڈ کی گئی تھیں۔ستیہ پال آنند صاحب جس ویڈیو میں غلام محمد قاصر کے اشعار اپنے کلام کے طور پر سنا رہے ہیں اس کی اپ لوڈنگ ڈیٹ 13.10.2008 درج ہے۔چیک کی جا سکتی ہے۔اس لیے سچی بات یہ ہے کہ کوئی ویڈیو ٹمپرنگ نہیں ہوئی۔ستیہ پال آنند نے اپنی ایک معصوم لغزش کا فراخدلانہ اعتراف کر لیا ہوتا تو آج یوں مزید تماشا نہ بنتے۔انہیں جھوٹ پر جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں اور ہر جھوٹ بےنقاب ہوتا جا رہا ہے۔اگر ستیہ جی کا ویڈیو ٹمپرنگ کا الزام سچ ثابت ہو جائے اور اس میں میرے ملوث ہونے کا ایک فی صد بھی ثبوت مل جائے تو جو ستیہ پال آنند کی سزا، وہی میری سزا۔

میرے نام اپنی ۲۵ر ستمبر ۲۰۱۱ء والی ای میل میں آنند صاحب نے لکھا ہے کہ:''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود غزل نہیں کہتا۔اور میں نے کبھی کوئی غزل کسی مشاعرے میں نہیں پڑھی۔''

اب انہیں کیسے یاد دلاؤں کہ انہوں نے چند غزلیں کہہ رکھی ہیں۔میرا جی کے انداز والی غزل تو وہ جرمنی والی تقریب میں بھی سنا کر گئے ہیں۔لیکن وہ اس سے صاف مکر سکتے ہیں۔سو میں ان کے اس بیان کی تردید بھی اسی درگا مندر کے کوی سمیلن کی ایک دوسری وڈیو سے کر دیتا ہوں۔مذکورہ کوی سمیلن ہی میں ستیہ پال آنند نے اپنی غزلیں بھی سنائی تھیں اور انہیں اس لنک پر سنا جا سکتا ہے۔

http://www.youtube.com/user/helloanoop#p/u/5/CgG47EPwoac

اس ویڈیو پر پہلے پچپن سیکنڈ کے بعد آنند صاحب کی غزلیں سنی جا سکتی ہیں۔

ستیہ پال آنند بطور نظم نگار اتنے اہم نہیں ہیں جتنا انہوں نے خود کو غزل کا مخالف ظاہر کر کے اہمیت حاصل کی ہے۔غزل کا کمال دیکھیں کہ اپنے مخالفوں کو بھی شہرت عطا کر دیتی ہے۔لیکن غزل بڑی ظالم صنف بھی ہے۔یہ کبھی کبھار اپنے مخالفوں سے انتقام بھی لیتی ہے۔غلام محمد قاصر مرحوم کے دو اشعار پڑھنے کی صورت میں ستیہ پال آنند صاحب کی معصومانہ لغزش سے لے کر وضاحت کے نام پر دلیرانہ جھوٹ پہ جھوٹ بولنا اور پھر ہر جھوٹ کا بے نقاب ہو

تے چلے جانا، یہ ستیہ پال آنند صاحب سے اردو غزل کا انتقام ہے۔

فاعتبرو یا اولی الابصار!

تحریر کردہ ۱۷ر نومبر ۲۰۱۱ء

مطبوعہ روز نامہ **ہمارا مقصد** دہلی

روز نامہ **نادیہ ٹائمز**۔دہلی ۱۸ر نومبر ۲۰۱۱ء

میرے منتخب افسانے

ڈاکٹر ستیہ پال آنند اردو نظم کے حوالے سے ایک اہم نام سمجھا جاتا ہے۔ان کی بنیادی شناخت نظم کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔لیکن ان کی ادبی شخصیت کا ایک مخفی گوشہ حال ہی میں کھل کر سامنے آیا ہے کہ وہ ایک طویل عرصہ سے تھوڑی تھوڑی افسانہ نگاری بھی کرتے رہے ہیں۔۱۹۴۹ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک انہوں نے جو افسانے لکھے،ان کا ایک انتخاب انہوں نے عمدگی کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔”میرے منتخب افسانے“ کے نام سے چھپنے والے اس افسانوی انتخاب میں بائیس افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

ابتدائی افسانوں میں ہندوستانی فضا کے ملے جلے موضوعات کے افسانے شامل ہیں تو بعد میں مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والی کہانیاں بھی شامل ہوتی گئی ہیں۔اپنی بدلتی ہوئی فضا کے اعتبار سے یہ ستیہ پال آنند کی ہجرت در ہجرت کی کہانیاں ہیں۔پاکستان سے انڈیا اور انڈیا سے امریکہ و کینیڈا۔اپنی نظموں کے برعکس ستیہ پال آنند کی کہانیاں جدید طرز میں نہیں لکھی گئیں،یہ عجیب سی بات لگتی ہے کیونکہ نظم نگاری میں ان کا طرزِ احساس جدید تر ہے۔تاہم ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ایسی کہانیوں کو ایسے ہی لکھا جانا چاہیے تھا۔اپنے افسانوں میں یہ انداز اختیار کر کے ستیہ پال آنند بحیثیت افسانہ نگار کامیاب رہے ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ”میرا نام انجم ہے“کسی طرح بھی منٹو کے”کھول دو“سے کم معیار کا نہیں ہے۔تقسیمِ برصغیر کے موقعہ پر ہونے والے فسادات پر کئی اعلیٰ پائے کی کہانیاں لکھی گئی تھیں۔یہ کہانی بھی اعلیٰ پائے کی ہے اور ۱۹۴۹ء میں لکھے جانے کے باوجود اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا جانا ادبی زیادتی ہے۔

ستیہ پال آنند کے پاس اپنی کہانیوں کے لیے نہ تو موضوعات کی کمی ہے اور نہ کرداروں کی۔واقعات کے تسلسل میں بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی انہیں آتا ہے”زود پشیماں“ کے بوڑھے ہوں یا ”چیچو کی ملیاں کی شہزادی“ کے پاگل،لال بادشاہ اور من بہادر کے بھولے اور کھرے کردار ہوں یا ”پتھر کی صلیب“ کا مصور،ستیہ پال آنند اپنے کرداروں کو ابھارنے میں کامیاب رہے ہیں۔اگر نظم نگار ستیہ پال آنند کو بلاوجہ درمیان میں لانے کی کوشش نہ کی جائے تو افسانہ نگار ستیہ پال آنند کی اہمیت سے انکار کرنا مشکل ہوگا۔

(مطبوعہ روز نامہ ہمارا مقصد دہلی۔شمارہ: یکم ستمبر ۲۰۱۰ء
جدید ادب جرمنی۔شمارہ ۱۶،جنوری ۲۰۱۱ء)

دونظموں کا قضیہ

ستیہ پال آنند کا جرمنی آنا، اپنے اعزاز میں تقریب کرانا اور پھر میزبان کا رسمی شکریہ تک ادا کیے بغیر چلے جانا۔ایک نئی ادبی تہذیب کا آغاز ہے۔اسے جو بھی نام دیا جائے اس کے ساتھ ”ستیا“ کا لفظ ضرور آنا چاہیے۔اس افسوس ناک میزبانی کے بعد میں نے اس تقریب کی روداد بھی لکھی اور ان کے ساتھ اپنے لاگ اور لگاؤ کی تفصیل پورے حوالہ جات کے ساتھ پیش کر دی۔یہ مارچ ۲۰۱۰ء اور ستمبر ۲۰۱۰ء تک کی باتیں ہیں۔چونکہ ستیہ پال آنند کے پاس میرے پیش کردہ حقائق کے جواب میں کہنے کے لیے کوئی مدلل بات نہ تھی، اس لیے انہوں نے مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لی۔میرا مقصد بھی اتنا ہی تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے، اچھے پیرائے میں ریکارڈ پر آجائے۔اس کے پورے نو مہینے کے بعد ستیہ پال آنند نے ایک نظم تخلیق کی۔اس نظم کا معاملہ اب ذرا بعد میں۔یہاں میں ان کے مزاج کے بارے میں ایک دو باتیں صاف گوئی کے ساتھ کر دینا چاہتا ہوں۔

بیشتر بڑے اور اہم ادیبوں کی وفات پر انہوں نے رپورتاژ ٹائپ کے مضامین لکھے ہیں۔انہیں میں کہیں پورے اور کہیں آدھے ادھورے حوالہ جات بھی ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی بہت ساری ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔خصوصاً جب وہ بغیر واضح حوالہ دیئے بعض بڑے اور اہم ادیبوں کے ساتھ اپنی بے تکلفی ظاہر کرتے ہیں۔یہ سارا سلسلہ صرف اپنی (غلط) اہمیت ظاہر کر کے خود کو بھی اہم ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔وہ چاہیں تو میں ان کے تین چار ایسے مضامین میں سے ایسی روشن مثالیں نکال کر ایک الگ مضمون میں پیش کر سکتا ہوں۔یہ

سب کچھ ان کے مزاج کی شہرت طلبی کا حصہ ہے۔باوقار طریقے سے اور سلیقے کے ساتھ کام کرتے ہوئے شہرت کی خواہش رکھنا کوئی بری بات نہیں۔

شہرت کے دو تین رُخ میرے نزدیک عام ہیں۔ایک باوقار طریقے سے اپنے ادبی کام کے ذریعے شہرت ملنا۔دوسرے اختلاف رائے رکھنے والے ادیبوں کے ساتھ علمی و ادبی مکالمہ کر کے اپنے موقف کی سچائی کو ظاہر کرنا اور اس حوالے سے پہچانے جانا، تیسرے اپنے حاسدین اور مخالفین کی بے جا مخالفت کا سامنا کرنا اور اس سے مناسب حکمت عملی کے ساتھ نمٹنا اور اس حوالے سے کامیابی حاصل کرنا۔

ستیہ پال آنند کے ہاں شہرت کے حصول کے لیے مثبت سے زیادہ منفی انداز نمایاں ہے۔مثلاً ان کا بنیادی حوالہ (چاہے وہ کیسے معیار کا ہی ہو) نظم نگار کا بنتا ہے لیکن ان کی شہرت اچھے نظم نگار کی نہیں بلکہ غزل کی مخالفت کرنے والے ادیب کی ہے۔اسی طرح ان کے رپورتاژ نما مضامین میں جو خامی ہے اس کا ہلکا سا اشارا کر چکا ہوں۔ان کی شہرت طلبی کی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔مثلاً کسی رنگ کی شہرت ملنے کا امکان دکھائی دیا تو پشاور کے احباب سے تعلق جتانے کے لیے اس حد تک چلے جائیں گے کہ یہ بات کسی طور ریکارڈ پر لائیں گے کہ ستیہ پال آنند پشاور کی مٹی کو خاکِ شفا سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر نذر خلیق نے اس خاکِ شفا کی وضاحت کرتے ہوئے خوب بتایا تھا کہ پشاور اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں ڈھیلے سے استنجا کرنے کا بہت زیادہ رواج ہے، ستیہ پال آنند کے لیے یہ خاکِ شفا ہے تو خدا انہیں مزید شفا عطا کرے۔

انہوں نے انگریزی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔اس میں ان کی تعریف میں اس حد تک مبالغہ آرائی بلکہ خوشامد سے کام لیا کہ ہر ادبی بندہ اس مضمون کو پڑھ کر حیران رہ گیا اور بیشتر لوگوں کی رائے یہی تھی کہ ستیہ پال آنند نے کوئی بڑا انعام پانے کے لیے یہ مضمون لکھا ہے۔بعض ادیبوں نے اسی روز فون کر کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو اپنے خیالات سے آگاہ بھی کر دیا۔ایک طرف یہ سلسلہ چلایا جا رہا تھا، دوسری طرف اسی دوران فیس بک کے ایک گروپ پر ستیہ پال آنند اس نام نہاد فلسفی اور ادبی در انداز کی تعریف لکھ رہے تھے، جس کی واحد

شناخت اچھی بات کو بھی بدتہذیبی کے ساتھ بیان کرنے کی ہے۔

کسی نے فیس بک پر درج ہونے والے یہ تاثرات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک بھی پہنچا دیئے۔اس کے بعد ظاہر ہے کہ اگر واقعی انعام کے حصول کی کوئی کاوش تھی تو وہ خطرے میں پڑ گئی۔ستیہ پال آنند نے سراسیمگی کے عالم میں ایک دو دوستوں سے پوچھا کہ فیس بک کی باتیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک کون پہنچا سکتا ہے؟ان کا تو فیس بک کے معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔

پھر کیا ہوا؟ یہ ستیہ پال آنند خود لکھیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ہاں میں اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ انہوں نے فیس بک کے ماڈریٹر کو خاصے سخت الفاظ میں پیغام بھیجا کہ جہاں مذکورہ ادبی درانداز جیسا زبان دراز ہوگا میں اس فورم میں شرکت نہیں کر سکتا۔میرے الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم مکمل طور پر یہی تھا۔اس پیغام کو پھر ایک دو دوستوں کو بھی ای میل سے بھیج دیا تاکہ ان کی صفائی کی سند رہے۔کہاں ایک شخص کی تعریف کی جا رہی ہے اور کہاں معاملات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے اسی کے خلاف سخت ترین زبان استعمال کی جا رہی ہے۔

یہ سارا سلسلہ کسی علمی و ادبی مکالمہ کے طور پر ہوا ہوتا تو ان کا ادبی حق بنتا تھا،لیکن معاملہ صرف ایک بڑے انعام کے حصول کے لیے لابنگ کا تھا،اور اس انعام کے لیبل کو اپنی شہرت میں اضافہ کا موجب بنانا تھا۔کچھ اسی خواہش کے پیش نظر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو خوش کرنے کے خیال سے اور کچھ میرے سابقہ مضامین کا کوئی جواب نہ دے پانے کے احساس کے ساتھ انہوں نے ایک نظم لکھی۔انہوں نے یہ نظم اپنے بعض احباب کو بھیجنے کے ساتھ ارشد خالد مدیر عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کو بھی بھیجی۔بعد میں معتبر ذرائع سے تصدیق ہوئی کہ یہ نظم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھی بھیجی گئی۔(جب مجھے یہ معلوم ہوا،میں نے اپنی جوابِ آں نظم بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھیج دی تھی۔لیکن جوابِ آں نظم کا ذکر ذرا بعد میں)۔

جب ستیہ پال آنند نے اپنی نظم ارشد خالد کو بھیجی تو انہوں نے فوری طور مجھے وہ میل فارورڈ کر دی،ساتھ ہی اپنی رائے لکھی کہ یہ نظم آپ کے خلاف لکھی گئی ہے۔میں نے اسی روز اس نظم کا

جواب لکھا اور اپنی نظم ارشد خالد کو بھیج دی۔ارشد خالد نے جیسے ستیہ پال آنند کی نظم اور میل مجھے فارورڈ کر دی تھی ویسے ہی میری نظم اور ای میل ستیہ پال آنند کو فارورڈ کر دی۔اس کے بعد ستیہ پال آنند اور ارشد خالد کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی،ارشد خالد نے مجھے فراہم کر دی اور اب ارشد خالد کی اجازت سے وہ من و عن یہاں درج کر رہا ہوں۔

ستیہ پال آنند بنام ارشد خالد

جناب ارشد خالد صاحب،آداب

میں نے آج صبح ہی ہفتے کے آخر کی تعطیل کے بعد واپس گھر آنے پر حیدر قریشی صاحب کی تحریر کردہ ”جوابِ آں نظم“ اپنی ای میل میں دیکھی۔میں نے اپنی نظم اشاعت کی غرض سے آپ کی ای میل ملنے کے بعد آپ کو بھیجی تھی۔آپ نے ہی شاید اسے ان کو فارورڈ کر دیا تھا۔کیوں؟اس بات کا پتہ مجھے نہیں ہے۔آپ نے ایسا کیوں کیا؟

میں یہ لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ نظم ان کی شخصیت یا کردار کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی تھی۔میرے سامنے تو ایک ”سٹیریو ٹائپ“ کردار تھا۔جسے میں نے فکشنلائز کیا۔خدا جانے ان کو یا آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا کہ یہ نظم ان کے بارے میں ہے۔میں گزشتہ ایک برس سے فارسی کے مقولوں اور عربی میں قرآن مجید کے ارشادات کو موضوع اور عنوان بنا کر نظمیں لکھ رہا ہوں۔میری دو درجن کے لگ بھگ ایسی نظمیں رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔کچھ شاید آپ نے دیکھی بھی ہوں۔یہ نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔میرے ذہن میں خدا گواہ ہے،اس بات کا کوئی خیال تو کیا شائبہ تک نہیں تھا کہ میں ان کی کردار کشی کروں۔نہ ہی یہ خیال پہلے تھا،نہ اب ہے،اور نہ مستقبل میں کبھی ہوگا۔

وہ میرے بارے میں جو لکھتے رہیں سر ماتھے پر!

آپ کا

ستیہ پال آنند ۱۳/جون ۲۰۱۱ء

....

ارشد خالد بنام ستیہ پال آنند

آنند جی!   آداب

چونکہ معاملہ سنجیدگی اختیار کر گیا ہے اس لیے مجھے بھی اردو فونٹ میں جواب لکھنا ضروری ہو گیا ہے۔آپ کی نظم میں اتنے واضح اشارے موجود ہیں کہ یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ یہ کسی اسٹیریو ٹائپ کردار کے بارے میں نظم تھی اور حیدر قریشی آپ کے سامنے نہیں تھے۔آپ اردو کے کسی سنجیدہ لکھنے والے کے سامنے یہ نظم رکھ دیں اور ساتھ ہی حیدر قریشی کا لاگ اور لگاؤ والا مضمون رکھ دیں۔کوئی بھی آپ کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرے گا کہ آپ نے حیدر قریشی کے بارے میں یہ نہیں لکھی۔سو آپ کو اس سلسلہ میں اپنے سچ کا سامنا کرنا چاہیے۔

حیدر قریشی سے میرا تعلق کوئی آج کی بات نہیں ہے۔جب وہ خانپور میں ہوائی چپل پہن کر سڑکوں پر گھوما کرتے تھے اور میں موٹر سائیکل پر ہوتا تھا،تب سے ہماری دوستی ہے۔عکاس کا پہلا شمارہ بھی اسی زمانے میں نکلا تھا۔اس لیے بے شک میں نے آپ کی نظم پڑھ کر انہیں بھیجی تھی،کیونکہ نظم ان کے خلاف لکھی گئی تھی۔تاہم جب انہوں نے جوابِ آں نظم لکھ کر بھیجی تو میں نے ان کی نظم بھی آپ کو بھیج دی۔حیدر قریشی کا خط بھی ساتھ ہی تھا۔اس خط سے ہی ظاہر تھا کہ وہ آپ کے ساتھ کسی لڑائی کے لیے ہرگز خوش نہیں ہیں لیکن آپ کی نظم نے یقیناً ایسی فضا پیدا کر دی۔

بات اتنی نہیں ہے کہ حیدر قریشی آپ کے بارے میں کچھ لکھ چکے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پورے شواہد کے ساتھ حقائق بیان کیے ہیں۔ان حقائق سے آپ کی اخلاقی حیثیت پر بہر حال ایک سوال اٹھتا ہے۔انگریزی کا ایک لفظ سوری ایسے معاملات میں بہت کام آتا ہے لیکن آپ جن احباب کے گھیرے میں ہیں شاید ان کی وجہ سے آپ کے لیے ایسا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔تو ٹھیک ہے آپ کا کیا ہوا آپ کے سامنے ہے اور حیدر قریشی کا کیا ہوا اُن کے سامنے ہے۔

نظم کے معاملہ میں پہلا سچ یہی ہے کہ یہ صاف صاف حیدر قریشی کے خلاف لکھی گئی ہے۔آپ اسے ہمیشہ کے لیے ضائع کرتے ہیں تو حیدر قریشی اپنی جوابی نظم کو ہمیشہ کے لیے ضائع کر

دیں گے۔آپ وقتی طور پر ضائع کرتے ہیں اور بعد میں یہ نظم سامنے آجاتی ہے تو حیدر قریشی کی نظم بھی اُسی وقت سامنے آجائے گی۔سو پہل بھی آپ کی طرف سے ہوئی اور اس معاملہ کا اختتام بھی آپ ہی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔آپ جو حکم فرمائیں۔

نیازمند

ارشد خالد   ۱۴/جون۲۰۱۱ء

....

ستیہ پال آنند بنام ارشد خالد

2011/6/14 Satyapal Anand <spanand786@hotmail.com>

Arshad Khalid Sahib....Please do not include my poem in your magazine. This email correspondence stops here. There should be no further communication.

Satyapal Anand

....

ارشد خالد بنام ستیہ پال آنند

آنند جی!

حیدر قریشی کے خلاف آپ کی نظم کو روک کر باقی نظمیں عکاس میں شامل رکھوں گا۔

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

متنازعہ نظم کہیں نہیں چھپے گی تو جوابِ آں نظم بھی کہیں نہیں چھپے گی۔میری طرف سے یا قریشی صاحب کی طرف سے اس معاملہ میں پہل نہیں ہوگی لیکن آپ کی متنازعہ نظم کہیں چھپ گئی تو پھر صرف دونوں نظمیں ہی نہیں اس پورے قضیہ کو اردو دنیا کے سامنے لانا پڑے گا۔

آپ کی پچھلی میل سے ایک کنفیوژن ہو رہا ہے،صرف وضاحت کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ میں نے آپ سے نظمیں بھیجنے کو بالکل نہیں کہا تھا۔میری کسی میل میں آپ ایسا نہیں دکھا سکیں گے۔نظمیں

آپ نے ازخود محبت سے بھیجی تھیں۔ویسے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کچھ بھیجا اور مجھے صورت حال کو ایک بڑی خرابی سے بچانے کا موقعہ مل گیا۔

آپ کا نیاز مند

ارشد خالد ۱۴؍جون ۲۰۱۱ء

....

اپنی انگریزی ای میل میں ستیہ پال آنند نے ارشد خالد کے جواب میں جو برہمی ظاہر کی ہے، بہت ہی بے معنی ہے۔کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے ایسے ہی ایک اور قضیہ میں خود ارشد خالد سے سوری کہہ کر نہیں بلکہ forgive لکھ کر معذرت کی تھی۔ان کی ۳؍جولائی ۲۰۰۹ء کی وہ ای میل آن ریکارڈ موجود ہے۔سو اب ابھی اپنی ہجویہ نظم پر سوری کہہ لینا اور اسے ڈراپ کر دینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔لیکن انہیں یہ گمان تھا کہ حیدر قریشی کے خلاف لکھی ہوئی نظم دیکھ کر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ خوش ہو جائیں گے۔اسی دوران ایک اور اہم دوست درمیان میں آئے۔انہوں نے ستیہ پال آنند کو اپنے طور پر اور اپنے انداز میں سمجھایا کہ آپ اپنی نظم کہیں شائع نہیں کریں تو حیدر قریشی بھی اپنی جوابی نظم کہیں نہیں بھیجیں گے۔وقتی طور پر انہوں نے یہ بات مان لی۔چنانچہ میں نے اپنی نظم صرف ان احباب کو بھیجی جنہیں ستیہ پال آنند اپنی نظم بھیج چکے تھے۔تا کہ ان احباب کے سامنے دونوں نظمیں موجود رہیں۔

اب مجھے کچھ دنوں سے ادھر اُدھر سے خبریں مل رہی تھیں کہ ستیہ پال آنند نے وہ نظم کہیں چھپنے کو بھیجی ہے یا چھپوالی ہے۔اس پر پہلے تو میں نے اس دوست سے رابطہ کیا جس نے درمیان میں آکر تھوڑا سا طے کرایا تھا کہ دونوں طرف سے ہجویہ اور جوابی نظمیں ڈراپ کر دی جائیں۔میرے استفسار پر اس دوست نے کسی حد تک تذبذب کا اظہار کیا۔تب میں نے براہ راست ستیہ پال آنند کو یہ ای میل بھیجی۔

حیدر قریشی بنام ستیہ پال آنند

۲۹؍مئی ۲۰۱۲ء کو بھیجی گئی ای میل:

آپ کی نظم اور میری جوابی نظم

مجھے ناصر عباس نیر صاحب نے کہا تھا کہ آپ اپنی نظم نہیں چھاپیں گے اور جواباً میں بھی اپنی نظم نہیں چھاپوں گا۔جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ نظم نارنگ صاحب کو بھی بھیجی ہے تو میں نے بھی انہیں بھیج دی تھی۔میں اس مبہم سی یقین دہانی پر قائم ہوں کہ آپ اپنی نظم کہیں نہیں چھپوا رہے۔

لیکن ساتھ ہی مجھے ادھر اُدھر سے اس حوالے سے کچھ خبریں مل رہی ہیں۔سو کسی افواہ پر یقین کرنے کی بجائے براہ راست آپ کو ای میل بھیج رہا ہوں۔اگر آپ کی مذکورہ نظم کہیں چھپ گئی ہے یا چھپ رہی ہے تو کسی لڑائی جھگڑے میں پڑے بغیر ہلکی سی وضاحت کے ساتھ مجھے بھی اپنی نظم سمیت دونوں نظمیں چھپوانا پڑیں گی۔اس کی تصدیق یا تردید آپ ہی کر سکتے ہیں۔سو ہر طرح کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے براہ راست آپ کو ای میل بھیج رہا ہوں۔

حیدر قریشی

....

اس ای میل کا ستیہ پال آنند نے کوئی جواب نہیں دیا تو اب میرے لیے ضروری ہو گیا کہ دونوں نظمیں ایک ساتھ شائع کر دوں۔سو دونوں نظمیں ایک ساتھ پیش ہیں۔

ستیہ پال آنند

کون و فساد و بودنی نابودنی

• مبر گمان تو اور د یقیں شناس کہ دزد

متاعِ من زنہاں خانۂ ازل بر دست

(غالبؔ)

ہے تو وہ شاعر یقیناً !

ساری اصنافِ سخن املاک میں شامل ہیں اس کی

نظم، دوہے، ماہیے، ہائیکو، غزل...اللہ جانے اور کیا کیا!
مختصر مضمون بھی لکھتا ہے اکثر
ایک خوبی اور بھی ہے
اپنے ہمعصروں کی تخلیقات میں، اور
سابقین و مقتدا شعراء کے مضمون و متن میں کچھ
مماثل دیکھ لیتا ہے اگر تو
ماورائے غور، فکر و خوض سے بیگانہ، فوراً بیٹھ جاتا ہے
(سمجھتا ہے).....کہ یہ 'تحقیق' ہے....'ریسرچ' اصلی!
'نقل' 'چربہ' 'کاربن کاپی'
'بعینہ' 'ہو بہو' 'سرقہ' وغیرہ لفظ تو موجود ہی ہیں
ان کے استعمال سے بس آدھ گھنٹے میں ہی
اپنا نامشخّص 'تجزیاتی تبصرہ' لکھ کر سمجھتا ہے کہ جیسے
معرکہ سر کر لیا ہو!

ناسپاس و ناستودہ یہ 'مدبّر'
ایسے دستور العمل کو کب بھلا پہچانتا ہے
جس میں کہ بین المتونیت کی رو سے
سب مضامین و متون و ماحصل ہم زائیدہ ہیں
حاشیہ آرائی یا تفسیر یا توجیہہ ۔ سب ہم نسل ہیں
تلمیح، تلطیف عبارت، تبصرہ، تاویل و استنباط سب ہم زوج ہیں
ذہن انسانی کے تہہ در تہہ خزانے میں نہ جانے کب سے ایسے
سینکڑوں مکنون و مخفی زاویے موجود ہیں جو

ہر نئے دن گفتگو میں، شاعری میں، نثر میں ڈھلتے ہیں
روشن اور بیّن!

بودنی نابودنی یہ 'شخص' کب سمجھا ہے پہلے یہ حقیقت
جو سمجھ جائے گا میری نظم سے اب؟....جانتا ہوں!

....

• (غالب کو بھی جب سرقہ کے الزامات کا جواب دینا پڑا تو اس بندۂ خدا نے یہ شعر لکھ کر گلوخلاصی حاصل کی)
•• اس نظم کا اشارہ کسی فردِ واحد کی طرف نہیں ہے۔

■■

حیدر قریشی

جوابِ آں نظم

(یہ نظم اسی کے بارے میں ہے جس کی نظم کے جواب میں لکھی گئی ہے)

میاں آزاد ہے وہ
ذات میں جس کی
میاں خوجی بھی بستا ہے
کہانی کار تھا وہ اور کہانی خوب لکھتا تھا

مگر آزاد نظموں کی لگن نے خوامخواہ
اس کے کہانی کار کو شاعر بنا ڈالا
الوہی شاعری کو بھی تماشا سا بنا ڈالا
میاں آزاد کے اندر میاں خوجی بسا ڈالا
اُسے یہ زعم تھا آزاد نظموں میں بھی
وہ قصے ہی لکھتا ہے
یہ زعم اب اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ وہ اب
تحقیق کے مضمون بھی آزاد نظموں ہی میں لکھتا ہے
وہ شاعر ہے مگر غزلیں نہیں کہتا
غزل کی صنف سے ناراض ہے خاصا
غزل کے شعر اس کو زہر لگتے ہیں
اسے احمد فراز اس واسطے اچھا نہیں لگتا
کہ اس کے گرد ہر دَم خوبصورت عورتوں
کا جمگھٹا کیوں تھا

وہ اپنی شاعری کا آپ دیوآنند بنتا ہے
مگر آنند جس کا جا چکا اور اب فقط اک دیو ہے
میرا جی و راشد سی شہرت کی تمنا کا
مگر اس کی حقیقت بھی
میاں آزاد کے اندر کے میاں خوجی جیسی ہے
میاں خوجی کہ جس نے اپنی نظموں کو
قرولی سا بنا ڈالا

سو اب جس سے بھڑکتا ہے
وہ اپنی فارسی زدگی پہ اتراتے ہوئے
نفرت میں اپنی ایسے اُس کو جھونک دیتا ہے
فقط دھمکی نہیں دیتا
قرولی نظم کی
سچ مچ اُسے وہ بھونک دیتا ہے!

■■

ستیہ پال آنند کے ساتھ میرے معاملات کی ساری روداد میرے ان سارے مضامین میں آ گئی ہے جو اس کتاب میں الگ سیکشن کے طور پر یک جا کر دیئے گئے ہیں۔ دو نظموں کا قضیہ بھی ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میں اس پر کوئی فیصلہ نہیں دے رہا۔ بس یہ سب کچھ ریکارڈ پر لا رہا ہوں۔

قارئینِ ادب اپنے طور پر جو نتیجہ اخذ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

■■

تحریر کردہ: یکم جون ۲۰۱۲ء

(کتاب ”تاثرات“ میں شامل کیا گیا ہے)

دو نظموں کا جائزہ

غزل میں اس کے مخصوص مضامین کی تکرار کو بہت سارے ناقدین نے نشان زد کرتے ہوئے اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دلائی ہے تو بعض لکھنے والوں نے پیش پا افتادہ مضامین سے نجات کے لیے غزل کی صنف کو ہی رد کرنا چاہا ہے کہ اس میں اب کسی نئے پن کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ایسے اعتراضات میں کہیں کچھ جزوی سچائی موجود ہے اور مضامین کی تکرار سے بچنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔اس نوعیت کی نشان دہی غزل میں مزید وسعت اور نئے مضامین کی گنجائش پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔اس جذبے کے ساتھ جو تنقید کی جائے وہ غزل کے ارتقا میں معاون ثابت ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ غزل میں مضامین کی تکرار عام طور پر پہلی نظر میں ہی پکڑی جاتی ہے۔اس لحاظ سے یہ غزل کی خوبی بھی ہے کہ بے شک اس میں یار لوگ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہیں لیکن وہ استفادہ صاف دکھائی دے جاتا ہے۔غزل کے برعکس جدید نظم میں کسی کے مضامین پر ہاتھ صاف کیا جائے تو عام طور پر استفادہ کرنے والے کے ہاتھ کی صفائی دکھائی نہیں دیتی۔چنانچہ اس سہولت سے فائدہ اُٹھا کر بعض نظم نگاروں نے خاصی لفظی کاری گری کا مظاہرہ کیا ہے۔عام طور پر کوئی نظم نگار ایسا کچھ کرتا ہے تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔لیکن جب کوئی نظم نگار اردو غزل کو مسلسل ہدفِ تنقید بنائے رکھے اور پھر خود اس کی اپنی نظمیں دوسروں کے مضامین سے استفادہ کرنے لگیں تو ان کی نشان دہی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔میں نے ۱۹۹۹ء میں ستیہ پال آنند کی نظم ''دھرتی پران'' کے بارے میں ظاہر کیا تھا کہ کس

طرح سے اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم ''اک کتھا انوکھی'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔وہ سارے حوالہ جات میرے مضامین کے مجموعہ ''تاثرات'' (صفحہ نمبر ۱۸۳،۱۸۴) میں شائع کیے جا چکے ہیں۔اپریل ۲۰۱۲ء میں ستیہ پال آنند کی ایک اور نظم بھرپور اور دہرے استفادہ کی مثال بن کر سامنے آئی۔

موت سے مہلت مانگنے کا خیال کوئی نیا مضمون نہیں ہے۔۔''موت'' کے عنوان سے معین احسن جذبی کی نظم اس موضوع پر شہکار کا درجہ رکھتی ہے۔''ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں'' کی نغماتی تکرار نے نظم میں ایسی انوکھی کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس موضوع کی دوسری نظموں میں شاید ہی کہیں دکھائی دے۔اردو غزل بھی اس موضوع کے اشعار سے بھری پڑی ہے۔ستیہ پال آنند مضمون کی جس تکرار کو کلیشے کی حد تک سمجھتے ہیں،اس حد سے بھی زیادہ اس مضمون کو غزل میں باندھا جا چکا ہے۔چند شعر بطور مثال:

اے اجل ذرا ٹھہر جا، میں کچھ اور دیر جی لوں
ابھی تلخیاں ہیں باقی، انہیں کر تو لوں گوارا
(دانش پیرزادہ)

اے اجل بہرِ خدا اور ٹھہر جا دَم بھر
ہچکیاں آئی ہیں، شاید میں اُسے یاد آیا
(میر مونس)

اجل ٹھہر کہ ابھی تیرے ساتھ چلتا ہوں
مگر یہ دیکھ ابھی میرے روبرو ہیں حضور
(بیکل اتساہی)

مِرے خدا مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے
اداس میرے جنازے پہ آ رہا ہے کوئی
(قمر جلالوی)

غزل کے حوالے سے اس مضمون پر مزید مثالوں کو یہیں روکتے ہوئے مجھے یہاں معروف فکشن رائٹر اور شاعرہ ترنم ریاض کی نظم "مہلت" اور ستیہ پال آنند کی نظم "نہیں، نہیں مجھے جانا نہیں ابھی" کا جائزہ پیش کرنا ہے۔اس جائزہ کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ ترنم ریاض کا شعری مجموعہ "پرانی کتابوں کی خوشبو" ۲۰۰۵ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔اس مجموعہ کے صفحہ نمبر ۱۰۱،۱۰۲ پر ان کی نظم "مہلت" شامل ہے۔

"ٹھہر جا اے اجل
اے مرگ کے ملکِ مہرباں
میں
جو جاؤں گی اچانک یوں
تو کتنے اَن کہے اشعار
میرے ساتھ جائیں گے

کئی افسانے، جو
کچھ دیر میں جیتی تو لکھ لیتی
کئی نغمے مجھے بچوں کے سہرے پر
جو گانے ہیں
وہ مجھ سے چھوٹ جائیں گے
وہ جن کی آس میں، میں نے

یہ تنہا دن گزارے ہیں
خوشی کے آنے سے پہلے وہ لمحے روٹھ جائیں گے

ٹھہر جا اے اجل، اے مرگ کے ملکِ مہرباں
میں
کہ یہ بھی جانتی ہوں
خوف سے تنہائی کے اکثر
مِری شاموں نے خود تم کو پکارا تھا

مجھے شب بھر کی مہلت دے
کہ دل پر فصلِ گل آنے کے کچھ ہی دن میں کھینچی تھی
پہاڑوں پر جو تصویریں
میں اک شب ساتھ ان کے رہ تو لوں تنہا
اور اپنی سوچ میں ہر شام کو جی لوں
ذرا اس سوکھتی ندی کا اک قطرہ ہی اب پی لوں
ٹھہر جا اے اجل، اے مرگ کے ملکِ مہرباں!"

ترنم ریاض کی نظم میں موت سے کچھ اور زندگی کی مہلت مانگی گئی ہے۔اور اس کے لیے جو جواز پیش کیا گیا ہے وہ ایک سے زائد معانی کا حامل ہے۔ادبی سطح پر ایک تخلیق کار کی حیثیت سے وہ اپنی کچھ اور شاعری اور کہانیوں کی تکمیل کی متمنی ہیں۔جسمانی سطح پر ایک ماں کی حیثیت سے بھی ان کا تخلیقی جذبہ انہیں اپنے بیٹوں کے سہرے کے نغمے گانے کی خواہش کے باعث مزید زندہ رہنے کا جواز دیتا ہے۔سو وہ موت سے پہلے اپنے یہ ادھورے تخلیقی کام پورے کرنے کے لیے موت سے مزید مہلت مانگتی ہیں۔یہاں موت کا خوف نہیں ہے بلکہ تخلیقی وفور ہے

جو اپنے اظہار کی تکمیل چاہ رہا ہے۔

ترنم ریاض کی نظم "مہلت" کے مطالعہ کے بعد اب ستیہ پال آنند کی نظم "نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی" کا مطالعہ کرتے ہیں۔

"نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ
ابھی سراپا عمل ہوں، مجھے ہیں کام بہت
ابھی تو میری رگوں میں ہے تیز گام لہو
ابھی تو معرکہ آرا ہوں، برسرِ پیکار
یہ ذوق وشوق، یہ تاب وتواں، یہ بے چینی
ابھی تو میرے تمتّع پہ منحصر ہے یہ جنگ

نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ
یہ رزمیہ جو مِری زیست کا مقدر ہے
یہ حرف حرف تحارب، یہ لفظ لفظ جہاد
مِرا یہ نعرۂ تکبیر، صف شکن "رن بیر"
اسے تو ظلم وتشدد کی جڑ کو کاٹنا ہے
اسے تو زشت خود دشمن سے جنگ جیتنی ہے

نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی، اے مرگ
کہ اب یہ لفظ مرے گل نہیں ہیں، کانٹے ہیں
مجھے پرونا نہیں کتخداؤں کے سہرے
مجھے سجانا نہیں باکرہ بتولوں کو
مجھے تو تیغ زن غازی کی طرح لڑنا ہے

مِری قضا، مجھے کچھ وقت دے کہ مجھ کو ابھی
جہاں کے فرضِ کفایہ کو پورا کرنا ہے"

(ستیہ پال آنند کی نظم "نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی"
مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ اپریل ۲۰۱۲ء)

ترنم ریاض کی نظم کا مرکزی خیال ستیہ پال آنند کی نظم میں پورے طور پر موجود ہے کہ موت سے مزید زندگی کی مہلت مانگ رہے ہیں۔اس کے لیے وہ اپنی کسی معرکہ آرائی کا جواز دیتے ہیں، ایسی معرکہ آرائی جس میں انہیں "ظلم وتشدد کی جڑ کو کاٹنا ہے" اور کسی "زشت خود دشمن سے جنگ جیتنی ہے"۔اس "کارِخیر" کے لیے وہ اپنے پھول لفظوں کو کانٹے بنا چکے ہیں اور لفظ کی تلوار لہراتے ہوئے غازی بننا چاہتے ہیں۔ان کا یہ شوقِ جہاد دیدنی ہے۔لیکن شوقِ جہاد میں صرف غازی بننے کی خواہش موت سے ان کے خوف کو ظاہر کرتی ہے۔جہاد میں تو شوقِ شہادت غالب ہوتا ہے اور یہاں موت سے بچنے کے لیے "جہاد" کی آڑ لی جا رہی ہے۔نظم کا عنوان "نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی" بجائے خود اس خوف کی تصدیق کرتا ہے۔یوں ترنم ریاض کی نظم کے تخلیقی وفور کے برعکس ستیہ پال آنند کی نظم پر موت کا خوف اور اس سے فرار کی کیفیت طاری ہے۔ایک جدید نظم نگار عمر کے آخری حصے میں جب قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں، ایک تو "ترقی پسند" لہجے میں بات کرنے لگے ہیں دوسرے ترقی پسندوں جیسے لہجہ کے باوجود ان جیسی بہادری نہیں دکھا رہے، بلکہ خوف خود ہی نظم سے جھلک رہا ہے، چھلک رہا ہے۔

جب کسی دوسرے کی نظم سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اس استفادہ کو چھپانے کی شعوری کوشش کی جائے تو اسی انداز کی نظم ہو پاتی ہے۔لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ترنم ریاض کے ہاں بیٹوں کی شادی کے سہرے کے نغموں کو گانے کی خواہش کا جذبہ، ان کے ہاں آ نہیں سکتا تھا۔تو انہوں نے کمال سادگی سے اسے یہ رنگ دے دیا۔

مجھے پرونا نہیں کتخداؤں کے سہرے
مجھے سجانا نہیں باکرہ بتولوں کو

پیش پا افتادہ مضامین پر معترض ہو کر اردو غزل کو دریا برد کرنے کی آرزو رکھنے والے کسی نظم نگار کا خود کمالِ مہارت سے دوسروں کی نظموں کے مرکزی خیال پر ہاتھ صاف کرنا کوئی مستحسن عمل نہیں ہے۔"شوقِ جہاد" کا تاثر بھی مصنوعی ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے نظم نگار نے غصے کی حالت میں قلم کو گنڈاسا بنا لیا ہے اور گنڈاسا پکڑے ہوئے موت سے مزید زندگی کی التجا کر رہا ہے۔اس مضحک کیفیت سے قطع نظر اب ان کی نظم "نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی" اگر ترنم ریاض کی نظم "مہلت" سے استفادہ کرتی دکھائی دے رہی ہے تو یا تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے،عام سی بات ہے اور اگر بری بات ہے تو یہ ستیہ پال آنند سے سرزد ہوئی ہے۔اگر اس موضوع کو بہت سارے شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے برتا ہے تو ستیہ پال آنند خود واضح کر دیں کہ انہوں نے کس شاعر کے انداز سے استفادہ کر کے یہ نظم لکھی ہے۔اگر میں نے ماخذ کی نشان دہی میں غلطی کی ہے تو وہ خود اپنے اصل ماخذ کے بارے میں بتا دیں۔

غزل کے چند اشعار بطور مثال پیش کرنے کے باوجود میں نے اپنی توجہ صرف دو نظموں کے مرکزی خیال کے جائزہ تک محدود رکھی ہے۔اگر ستیہ پال آنند کی نظم کا پورا پوسٹ مارٹم کرنا مقصد ہوتا تو اس پر مزید بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔"بہت کچھ" جو لکھا جا سکتا تھا،نظم کے آغاز سے ہی اس کی صرف ایک مثال یہاں پیش کر دیتا ہوں۔نظم کی ابتدا کرتے ہوئے ستیہ پال آنند نے جو یہ فرمایا ہے:

"نہیں،نہیں مجھے جانا نہیں ابھی،اے مرگ
ابھی سراپا عمل ہوں،مجھے ہیں کام بہت
ابھی تو میری رگوں میں ہے تیز گام لہو"

اس کے ساتھ اب غالبؔ کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں،اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

نظم کی ابتدائی تین سطروں میں غالب کے شعر کی لفظیات کو صرف آگے پیچھے کرنے اور کہیں

معنی کو اُلٹا کر دینے کے علاوہ ستیہ پال آنند کا اپنا کیا ہے؟ ستیہ پال آنند کبھی سوچیں کہ غزل پر جو اعتراض وہ کرتے رہے ہیں وہ کیسے پلٹ کر ان کی نظم نگاری کی طرف بار بار آ رہے ہیں۔

میں نے اسے ستیہ پال آنند سے اردو غزل کا انتقام قرار دیا تھا اور بالکل درست لکھا تھا۔

موت کے موضوع پر بات ہو رہی ہے تو اپنی ایک غزل کا یہ شعر ستیہ پال آنند کی نذر کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اور تھے حیدر جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

ستیہ پال آنند: حیدرقریشی اور جدیدادب کے حوالے سے

Remember Haider Bhai,I´ve always had great regards for you.

ستیہ پال آنند

جدیدادب شمارہ نمبر۹۔صفحہ نمبر۲۱۲

Jdeed Adab is in my hand - and , indeed, it is superb.

ستیہ پال آنند

جدیدادب جرمنی شمارہ نمبر۱۱۔صفحہ نمبر۲۵۷

شمارہ نمبر۱۱ کے مشمولات توقع سے بڑھ کر ہیں۔ٹائٹل پر آپ کا ماہیا لوک تہذیب کے اس ورثے کی یاد دلاتا ہے جس میں پہلی سطر صرف قافیہ پیمائی کے لیے ہی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اس کا براہ راست تعلق آخری دو سطروں کے تصویری مفہوم سے جُڑا ہوا ہوتا ہے۔بچپن میں ہم سب پنجابی میں فی البدیہ ماہیے "بنایا" کرتے تھے،لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ مصرع اولیٰ صرف قافیہ ملانے کے لیے ہی نہیں ہوتا۔ **ستیہ پال آنند**

جدیدادب جرمنی۔شمارہ نمبر۱۲۔صفحہ نمبر۲۸۴

----

urdu_writers@yahoogroups.com سے بارہ دسمبر ۲۰۰۹ء کو ارشد خالد کی جانب سے جدید ادب جرمنی کے شمارہ نمبر۱۴ کے ریلیز کیے جانے کی خبر جاری کی گئی۔اس پر ۱۵دسمبر ۲۰۰۹ء کو کسی نے اسے فیس بک پر بھی شائع کیا تو **ستیہ پال آنند** نے "جدیدادب" کے بارے میں وہاں یہ کمنٹس دیئے۔ **"اس تاریخ ساز رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"**

بحوالہ جدیدادب جرمنی شمارہ نمبر۱۵۔صفحہ نمبر۳۰۲

حیدرقریشی کی کتاب
"ستیہ پال آنند کی.......بودنی نابودنی"
پر موصولہ چند تاثرات

ڈاکٹر انور سدید(لاہور،پاکستان): آپ کا گراں قیمت تحفۂ خلوص "ستیہ پال آنند۔۔۔بودنی نابودنی" مل گیا ہے۔اس کرم کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔حیدرقریشی صاحب سے ملاقات باندازِ دگر ہوئی۔انھوں نے نیا محاذ کھول لیا ہے لیکن یقین ہے وہ اس محاذ پر بھی کامران و کامیاب ہوں گے۔۔۔حیدرقریشی صاحب نے چند نئی اور ناقابلِ یقین باتیں بازیافت کی ہیں تو میں حیرت زدہ ہوں۔ **بنام ارشد خالد۔۱۱ستمبر۲۰۱۳ء**

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

مرزا خلیل احمد بیگ(علی گڑھ،حال نیویارک،امریکہ): **ڈئیر حیدرقریشی صاحب** کتاب ملی،بہت بہت شکریہ۔ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔آپ نے تو ستیہ پال آنند جی کھال اُدھیڑ کر رکھ دی۔میں تو انہیں ایک نہایت معتبر اور ذمہ دار ادیب سمجھتا تھا لیکن وہ تو کچھ اور ہی نکلے۔ ع

ہیں کواکب کچھ،نظر آتے ہیں کچھ

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

نند کشور وکرم(چیف ایڈیٹر عالمی اردو ادب۔دہلی،انڈیا): **ڈئیر حیدر قریشی صاحب**۔ستیہ پال آنند صاحب پر کتاب "بودنی،نابودنی" لکھنے اور چھاپنے پر آپ کو اور آنند صاحب کو بہت بہت مبارک۔

Congrats.Very informative articles. NKV

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

خادم علی ہاشمی(ملتان،پاکستان):

عزیزم حیدرقریشی صاحب! سلام مسنون،آج صبح سویرے جو میل کھولی تو سب سے پہلے ستیہ پال

آنند صاحب کے حوالے سے”بودنی نابودنی“ کواول سے آخر تک پڑھا۔بہت خوب۔آپ نے جس جانفشانی کے ساتھ”استفادہ“اورخیالات کے سرقہ کی راہ کھوجی ہے،قابلِ صد ستائش ہے۔آپ کے دلائل وزنی اور برمحل ہیں۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

رؤف خیر(حیدرآباد،دکن،انڈیا):

ستیہ پال آنند کے بارے میں آپ کی کتاب زبردست ہے۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

پروفیسر ڈاکٹر مظہر مھدی(جواہرلال نہرو یونیورسٹی،دہلی):

ستیہ پال آنند پر کتاب کی اشاعت پر دلی مبارک باد!

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

اکرم کنجاھی(ایڈیٹر”غنیمت“کراچی/گجرات): بہت مبارک ہو آپ کو!

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ڈاکٹر رضیہ حامد(بھوپال):ستیہ پال آنند والی کتاب پڑھ لی۔آپ نے سب مضامین یکجا کر دیئے،یہ اچھا کیا۔ ان میں سے کئی میں پہلے پڑھ چکی تھی۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ستیہ پال آنند:مہاتماخود

میری کتاب”ستیہ پال آنند کی بُودنی نابُودنی“نومبر۲۰۱۳ء کے شروع میں شائع ہوگئی تھی۔اس دوران مجھے ایک تو رؤف خیر کا لکھا ہوا ایک مضمون”ایک نیا اندازِ سرقہ“ پڑھنے کا موقعہ ملا اور نومبر۲۰۱۳ء کے آخری ہفتہ میں ستیہ پال آنند صاحب کا ایک انٹرویو یوٹیوب پر دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا۔

پہلے رؤف خیر کے مضمون کا ذکر۔۔رؤف خیر کے مضمون میں غزل کے شعر کو اُڑا کر اسے بے جا پھیلا کر نظم کہہ لینے والی ستیہ پال آنند کی عادت کو ایک نئے ثبوت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔رؤف خیر کا مضمون مجلّہ”مخزن“لاہور جلد نمبر۱۱،شمارہ نمبر۲(مسلسل شمارہ نمبر۲۲)میں شائع ہوا تھا۔ان کی کتاب”بچشمِ خیر“مطبوعہ ۲۰۰۷ء میں شامل تھا۔ستیہ پال آنند جو غزل کے مضامین پر کلیشے کا الزام لگاتے ہیں،غزل کے کلیشے قسم کے خیال والے شعروں کو ہی غیر ضروری طور پر پھیلا کر،اپنی نظم بنا کر جدید نظم میں نئے گل کھلا رہے ہیں۔جس کے نتیجہ میں اردو نظم کا کوئی **گلدان** تیار نہیں ہو رہا بلکہ نظموں کا ایسا انبار تیار ہو رہا ہے جو اصلاً غزل کا **اگالدان** ہے۔اردو شاعری میں مسئلہ جبر واختیار کو سو رنگ سے باندھا گیا ہے۔ان سو رنگوں میں سے ایک رنگ کی رؤف خیر نے نشان دہی کی ہے۔ان کے مطابق پہلے یگانہ چنگیزی نے”وسعتِ زنجیر تک آزاد“ ہونے کی ترکیب کے ذریعے اس موضوع کو اپنی ایک رباعی میں یوں بیان کیا:

ہوں صید کبھی،اور کبھی صیاد ہوں میں　　　کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں

مختار۔۔۔مگر اپنی حدوں میں محدود　　　ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں

شاہد صدیقی ۱۹۱۱ء میں اکبرآباد(آگرہ)میں پیدا ہوئے،۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔شاہد صدیقی کا شعری مجموعہ”چراغِ منزل“۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی

اردو، حیدرآباد دکن کی زیرنگرانی شائع ہوا۔اس مجموعہ میں ان کی ایک غزل کا مطلع یگانہ چنگیزی کی بیان کردہ ترکیب سے استفادہ کرتے ہوئے غزل میں یوں ''کلیشے''بن گیا۔

جبرِ فطرت نے یہ اچھا کرم ایجاد کیا کہ مجھے وسعتِ زنجیر تک آزاد کیا

اور یہی ''وسعتِ زنجیر تک آزاد''ہونے کا ''کلیشے''،مضمون ستیہ پال آنند نے ایک نظم ''اپنی زنجیر کی لمبائی تک''میں بیان کیا تو گویا نظم کو ''تر و تازہ'' کر دیا۔رؤف خیر کی درج کردہ ستیہ پال آنند کی نظم کو یہاں دہرا دیتا ہوں۔

''اپنی زنجیر کی لمبائی تک

کچھ برس پہلے تک (پوری طرح یاد نہیں) /میں بھی آزاد تھا،خود اپنا خدا تھا مجھ میں /قوت کار بھی تھی، جراتِ اظہار بھی تھی /گرمیٔ فعل و عمل، طاقتِ گفتار بھی تھی /میں کہ خود اپنا مسیحا تھا، خود اپنا مالک، کچھ برس پہلے تک (پوری طرح یاد نہیں) /اب مجھے حکم عدولی کا کوئی شوق نہیں /بے زباں طاقتِ گویائی سے محروم ہے اب، ماسوا اس کے کہ شکراً کہے خاموش رہے /اب مجھے گالیاں سننا بھی گوارا ہے کہ میں حرفِ دشنام ہو یا حرفِ پذیرائی ہو /فرق لہجے کا، سمجھ سکتا ہوں الفاظ سبھی سرزنش کے ہوں یا تعریف کے۔مالک کی زباں /جو بھی ارشاد کرے میرے لیے واجب ہے /ہاں مجھے دیکھنے چپ رہنے کی آزادی ہے /اور میں گھوم کر کچھ دور تک چل سکتا ہوں /اپنی زنجیر کی لمبائی تک آزاد ہوں میں!''

(نظم مطبوعہ ماہنامہ پرواز لندن۔جنوری ۲۰۰۶ء)

شاہد صدیقی کا شعر صرف اس لیے پیش کیا ہے تا کہ سند رہے کہ یگانہ کی ترکیب استعمال کر کے یہ مضمون ''کلیشے''بن چکا ہے اور ستیہ پال آنند اس کلیشے مضمون سے کیسے استفادہ کر رہے ہیں۔وگرنہ اس نظم کے حدود اربعہ کو ظاہر کرنے کے لیے یگانہ چنگیزی کا کلام کافی تھا۔اس نظم میں کھینچ تان کے طور پر خود ہی اپنا خدا ہونے کا جو بیان دیا گیا ہے، وہ بھی یگانہ چنگیزی سے ہی مستعار لیا ہوا ہے۔گویا بنیادی خیال اور کلیدی ترکیب کو اُڑانے کے بعد نظم کو لمبا کرنے کے لیے بھی انہوں نے یگانہ چنگیزی سے ہی استفادہ کیا ہے۔یگانہ کا مشہور شعر ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اب بتائیے ان اشعار کے سامنے ستیہ پال آنند کی نظم میں ان کا اپنا کیا رہ گیا ہے؟ غزل کے ''کلیشے'' بنے ہوئے مضامین کو اُڑا کر ان مضامین سے نظمیں گھڑنے والے ستیہ پال آنند صاحب کی نظموں کی یہی حقیقت ہے، یہی اصلیت ہے۔انجمن امداد باہمی کے ذریعے ان کی جتنی ستائش کر لی جائے، کرا لی جائے، انجمن امداد باہمی والے اردو کی ترقی کے نام پر اردو کے زوال کا باعث ہی بنے رہیں گے۔

یہاں رؤف خیر کے مضمون کے فیصلہ کن الفاظ کو درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔رؤف خیر لکھتے ہیں:

''شاہد صدیقی کے مذکورہ ایک مطلعے کو وضاحتی وسعت دے کر ستیہ پال آنند نے ایک نظم میں ڈھال لیا لیکن تاثر کے اعتبار سے دل چھو لینے والا یہ مطلع ان کی پوری نظم پر بھاری ہے۔اب تو انہیں غزل کے اعجاز کا قائل ہو جانا چاہیے کہ دو مصرعوں میں شاعر جو آتشِ نم چھپا دیتا ہے وہ خاشاکِ نظم کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔''

اب حال ہی میں ستیہ پال آنند نے اپنی ایک ''بودنی'' کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ غزل کے مخالف نہیں ہیں۔وہ غزل کے مخالف رہیں یا نہ رہیں، اس سے غزل کا کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہونے والا، لیکن ان کی ''بودنی'' کا تاثر کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس معاملہ میں ستیہ پال آنند کو اپنے لکھے ہوئے سارے الفاظ اور اپنے آن ریکارڈ موجود الفاظ کا سامنا کر کے، اپنے پہلے لکھے کی برملا تکذیب کرنی ہوگی، غزل کی حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا، ورنہ ان کی کسی ''بودنی'' کا کوئی تاثر بے معنی رہے گا چاہے وہ در پردہ ان کا اپنا تیار کرایا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ویسے اردو غزل نے ستیہ پال آنند سے جو انتقام لیا ہے اور ان کا جو حال کیا ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور عبرتناک بھی۔

اب میں ستیہ پال آنند کے تازہ انٹرویو کی جانب آتا ہوں۔اصلاً یہ انٹرویو ان کی نئی کتاب ''کتھا چار جنموں کی'' کے حوالے سے ہوا ہے۔جو اس لنک پر دستیاب ہے۔

http://www.youtube.com/watch?v=e7zEkYs7Qew&feature=youtu.be&a

اتفاق سے کتابوں کے ناموں کا توارد ہو جانا، بڑا عیب نہیں ہے، لیکن جب دیدہ دانستہ دوسروں کے کسی امتیازی وصف کو خول کی طرح خود پر چڑھانے کی کوشش کی جائے تو اسے بہرحال معیوب گردانا جائے گا۔اس انٹرویو میں مذکور ''کتھا چار جنموں کی'' کتاب کا نام ہی ماخوذ ہے۔جوگندر پال جی جب اسّی سال کے ہوئے تھے تو میں نے **جدید ادب** کے شمارہ نمبر ۵۔جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء میں ان کا خاص گوشہ شائع کیا تھا۔اس گوشہ کا پہلا مضمون علی احمد فاطمی کا تھا اور اس کا عنوان تھا ''**چار جنموں کا مسافر۔جوگیندر پال**''۔لنک پیش کر رہا ہوں۔

http://www.jadeedadab.com/archive/2005july/mazameen6.php

علی احمد فاطمی نے یہ عنوان خود سے نہیں دیا تھا بلکہ جوگندر پال کے ''خود وفاتیہ'' سے اخذ کرتے ہوئے جمایا تھا۔اپنے اسی مضمون میں علی احمد فاطمی نے جوگندر پال جی کے خود وفاتیہ کا متعلقہ اقتباس بھی پورے طور پر درج کر دیا تھا۔ستیہ پال آنند کو چار جنموں کی ترکیب اچھی لگی تو کسی معقول حوالے کے ساتھ اسے اختیار کرنے کی بجائے انہوں نے اپنی نام نہاد ''دانشوری'' ظاہر کرتے ہوئے اپنی زندگی کی روداد کا نام ''**کتھا چار جنموں کی**'' کر دیا ہے۔اس سے جناب ستیہ پال آنند کی خوشہ چینی، اکتساب، استفادہ اور (داؤ لگے تو) سرقہ کی حد تک چلے جانے کا رویہ مزید ظاہر ہو رہا ہے۔ارے بھائی! فاطمی کا عنوان اتنا ہی اچھا لگا ہے تو اپنے جنموں میں ہی کچھ کمی بیشی کر لو۔چار کی بجائے تین کر لو یا پانچ، چھ کر لو۔اگرچہ پکڑنے والوں نے پھر بھی اصل ماخذ تک پہنچ جانا تھا لیکن چلو ایک ہلکی سی لحاظ داری تو رہ جاتی۔

اپنے انٹرویو میں ستیہ پال آنند نے ایک پنجابی شعر سنا کر بتایا ہے کہ وہ بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں آ گئے۔غربت کے حالات کے باعث جوگندر پال یہ بات تب کا لکھ چکے ہیں جب ستیہ پال آنند نے ابھی اردو نظم نگاری شروع نہیں کی تھی۔''میں اپنے اولین عہدِ طفلی میں ہی بوڑھا ہو گیا'' (**مضمون ''پل بھر زندگی'' از جوگندر پال،**

بحوالہ جدید ادب خانپور۔جوگندر پال نمبر۔سال اشاعت ۱۹۸۵ء۔صفحہ نمبر ۵۸)

مختلف لوگوں کے زندگی کے حالات ملتے جلتے ہو سکتے ہیں، لیکن پھر کوئی بڑا دعویٰ کیے بغیر ہی بات

کرنی چاہیے۔

جب کوئی بندہ عمر کے اسّی سال عبور کر جانے کے بعد بھی اپنی ''عظمت'' کا پرچم خود لہراتا پھر رہا ہو تو اسے معذور سمجھ کر درگزر سے کام لیا جا سکتا ہے۔تاہم اس انٹرویو میں ستیہ پال آنند نے سیاق وسباق سے ہٹ کر اچانک گوتم بدھ ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور وہ بھی بیس تیس برس کی عمر میں۔ان کے اپنے بقول:

''بیس تیس برس کی عمر تک اتنا کچھ اکٹھا کر چکا تھا میں، کہ خود کو میں نے گوتم بدھ سمجھنا شروع کر دیا۔''

مہاتما بدھ کی عظمت اور عزت ان کی تعلیمات اور کردار میں ہم آہنگی سے عیاں ہے۔مہاتما بدھ نے تخت تاج، عزت، شہرت، دولت، تمام خواہشات کو تج دیا تھا۔آج کئی ملکوں کے حکمران اپنے تخت و تاج، اپنی عزت، شہرت اور دولت سمیت اپنے سر مہاتما بدھ کے قدموں پر جھکا دیتے ہیں۔ایک جہان ان کے سامنے اپنے سر جھکا رہا ہے۔کہاں مہاتما بدھ کی عظیم ہستی اور کہاں ہمارے یہ ''**مہاتما خود ستیہ پال آنند**'' جنہیں بیاسی سال کی عمر میں بھی یہ حسرت ہے کہ وہ زندگی میں عیش و عشرت نہیں کر سکے۔

مہاتما خود، ستیہ پال آنند اپنی کتاب کا ایک امتیازی وصف اپنے بعض دوستوں اور نارنگ صاحب کے حوالے سے اس انٹرویو میں یہ بتاتے ہیں کہ اس میں زندگی کے حالات سے زیادہ آس پاس کے لوگوں کے بارے میں اور ادب کے تناظر میں بات کی گئی ہے جو دنیا میں اپنی قسم کی واحد کتاب ہے۔''کتھا چار جنموں کی'' کے بارے میں اگر واقعی ان کے دوستوں نے ایسی بات کہی ہے تو انہوں نے ستیہ پال آنند کے ساتھ مذاق کیا ہے۔اور اگر آنند صاحب خود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں تو وہ بھی اپنے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔دنیا جہان کی خود نوشتوں کے بارے میں تو چھوڑیں، خود اردو میں ہمارے قریب ترین بزرگ ڈاکٹر وزیر آغا کی خود نوشت ''شام کی منڈیر سے'' مذکورہ اوصاف کی حامل کتاب ہے۔کہیں ستیہ پال آنند نے وزیر آغا کے انداز سے خوشہ چینی تو نہیں کی؟ کتاب کے نام سے لے کر ''منفرد انداز'' تک ہر کام میں خوشہ چینی کا عمل اور پھر اس برتے پر مہاتما بدھ ہونے کا دعویٰ۔

ستیہ پال آنند کا المیہ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں مسلسل اخذ واکتساب سے استفادہ تک کا عمل دکھائی دیتا ہے۔اردو دنیا کے بڑے طبقے کو خوش کرنے کے لیے وہ عربی وفارسی حوالوں کو اپنا ماخذ بناتے ہیں تو مغربی دنیا میں مہاتما بدھ کی فکری مقبولیت دیکھ کر وہ ان کی تعلیمات اور ان کے دور کی فضا کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں۔مقصد ہر جگہ ایک ہی ہے کہ شہرت کا جو شارٹ کٹ بھی ملتا ہے،اسے اختیار کرلو۔

مہاتما بدھ کے بارے میں ایک جہان نے لکھا ہے۔جغرافیائی اور لسانی طور پر اپنے مقامی حوالوں سے بات کروں تو جرمنی کے ممتاز ادیب ہرمن ہیسے کا ناول ”سدھارتھ“ ایک شاندار حوالہ بنتا ہے۔ہرمن ہیسے نے اپنے ناول ”سدھارتھ“ میں خود کو گوتم بدھ کے برابر لانے کی جسارت نہیں کی۔اس سلسلہ میں جدید ادب جرمنی،شمارہ نمبر ۱۱،جولائی ۲۰۰۸ء میں ”سدھارتھ“ پر بات کرتے ہوئے میں یہ لکھ چکا ہوں:

”ہرمن ہیسے نے ہندوستان کے سفر کے دوران گوتم بدھ کا جو احوال سنا اُس کی روشنی میں اپنی زندگی کو دیکھنے کی کاوش کی۔اس کاوش میں ہرمن ہیسے کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے چند ازلی سوالوں کے ساتھ حقیقتِ عظمیٰ کی جستجو اور تلاش کا سفر تو کر رہا ہے لیکن اسے گوتم بدھ جیسے گیان کی منزل نصیب نہیں ہوسکتی۔سو اس نے خود کو گیان کی روشنی سے پہلے والے سدھارتھ کے مقام پر رکھا اور اسی نام کے ساتھ اپنی جستجو کا سفر شروع کیا جو ظاہر ہے ایک نامختتم سفر ہونے کے باعث کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔تاہم اس سفر میں جو کچھ پیش آیا وہ سب بجائے خود اس کی زندگی کی روحانی واردات کا حصہ شمار کیا جا سکتا ہے۔“

ستیہ پال آنند میں ہرمن ہیسے جیسا ظرف تو خیر کہاں سے آتا،تاہم وہ تھوڑی سی عقل سے کام لیتے تو بیس تیس برس کی عمر میں گوتم بدھ بننے کا مضحکہ خیز دعویٰ کر کے خود ہی اپنی تضحیک کا باعث نہ بنتے۔

اردو فکشن میں انتظار حسین نے بدھ جاتکوں سے جو اکتساب کیا ہے،وہ ظاہر و باہر ہے۔وزیر آغا کے فکری مضامین سے لے کر ان کی نظموں تک میں مہاتما بدھ کا فیض بھی دکھائی دیتا

ہے اور کئی مقامات پر ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی فکر سے اختلاف بھی موجود ہے۔اب اگر ستیہ پال آنند نے مہاتما بدھ کی شخصیت اور ان کی تعلیمات کے کچے پکے اشارے دے کر اپنی نظموں کو مزیّن کرنے کی کاوش کی ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔گڑ بڑ وہاں ہوئی ہے جب انہوں نے اپنی ایسی نظموں سے خود ہی متاثر ہو کر اپنے آپ کو مہاتما بدھ جیسا قرار دے ڈالا ہے۔اور وہ بھی اپنے ماضی بعید میں جا کر بیس تیس سال کی عمر میں مہاتما بدھ بن بیٹھے ہیں۔اس سے ستیہ پال آنند کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔اُلٹا ستیہ پال آنند کی شخصیت **”مہاتما خود“** کی مضحکہ خیز صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔مہاتما بدھ کے گیان سے نروان تک کے جن فرمودات کو انہوں نے محض اشاراتی لفاظی کی حد تک بیان کیا ہے،وہ خود ان کی روح سے یکسر ناواقف دکھائی دے رہے ہیں،وگرنہ اس باب میں اپنی طرف سے کوئی انکشاف تو فرماتے۔پہلے سے کہے گئے الفاظ کو دہراتے جانا بعض اوقات لفظوں کی جگالی کہلاتی ہے۔کاش ہمارے **مہاتما خود ستیہ پال آنند** پہلی عظیم ہستیوں کے عظیم فرمودات کو اپنی روح کا جزو بنا کر پھر اپنی طرف سے کچھ نیا کہہ پاتے۔ابھی تک وہ صرف پہلے مقدس فرمودات کی جگالی ہی کر رہے ہیں۔ایسا نہ ہوتا تو ”مہاتما خود ستیہ پال آنند“ کو بدھ جیسا ہونے کا مضحکہ خیز دعویٰ نہ کرنا پڑتا۔دنیا خود ان کا اعتراف کرتی۔پھر کسی بھی جیسا ہونا کیوں؟ جینوئن تخلیق کار تو اپنے جیسا آپ ہوتا ہے۔اس کا چھوٹا یا بڑا ہونا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اس کا جینوئن ہونا اہم ہوتا ہے۔جینوئن تخلیق کار جہاں کہیں سے بھی فیض حاصل کرے لیکن اپنے مجموعی تخلیقی ظہور میں وہ اپنے جیسا آپ ہوتا ہے۔کسی اور جیسا نہیں ہوتا۔ستیہ پال آنند کو تخلیقیت کا اتنا سا گیان بھی نصیب ہوا ہوتا تو وہ گیان اور نروان کی سطحی باتیں نہ کرتے۔

میری کتاب ”ستیہ پال آنند کی۔۔۔بودنی،نابودنی“ کی اشاعت کے معاً بعد ستیہ پال آنند کے ارد گرد سے اور خود ان کی طرف سے بھی چند باتوں کا اعتراف سامنے آ گیا ہے اور اس اعتراف میں چند نئی باتیں بھی سامنے آئی ہیں۔مثلاً ستیہ پال آنند ایک طویل عرصہ تک ہندی،پنجابی اور انگریزی میں لکھتے رہے ہیں۔ان زبانوں میں بھی نثر میں خامہ فرسائی کرتے

رہے ہیں۔ساٹھ سال کا ہو جانے کے بعد انہوں نے اردو نظم کا رخ کیا۔اس سے میرا پہلا اندازہ درست نکلا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مذکورہ بالا تینوں زبانوں میں لکھے گئے کو کوئی اہمیت نہیں ملی تو انہوں نے اردو کا رُخ کیا اور اس میں غزل کی مخالفت کا اعلان کر کے نظم نگاری شروع کر دی۔

یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہندی میں ستیہ پال آنند نے جاسوسی ناول بھی لکھے۔اردو میں ابنِ صفی کے لکھے ہوئے ناول پورے برصغیر میں مقبول ہیں۔ ہندی سے لے کر انگریزی تک میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔کمرشیل سطح پر سہی، ابنِ صفی کے ناولوں کے مقابلہ میں ستیہ پال آنند کے جاسوسی ناول کہیں دکھائی دیتے ہیں؟

میں اپنے مضمون ''دو نظموں کا قضیہ'' میں ستیہ پال آنند کے بارے میں یہ بات لکھ چکا ہوں کہ ان کے ہاں:

''کہیں پورے اور کہیں آدھے ادھورے حوالہ جات بھی ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی بہت ساری ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔خصوصاً جب وہ بغیر واضح حوالہ دیئے بعض بڑے اور اہم ادیبوں کے ساتھ اپنی بے تکلفی ظاہر کرتے ہیں۔یہ سارا سلسلہ صرف اپنی (غلط) اہمیت ظاہر کر کے خود کو بھی اہم ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔''

ستیہ پال آنند کا یہ رویہ جابجا موجود ہے۔''کتھا چار جنموں کی'' پر انعام الحق کی رائے میں (بحوالہ چہارسو) ستیہ پال آنند کے اقتباس سے ظاہر کیا گیا ہے کہ تلوک چند محروم اور جوش ملیسانی نے کہا تھا کہ اس نوجوان کا مزاج صرف نظم کے لیے موزوں ہے۔(دروغ برگردن ستیہ پال آنند)۔

پہلی بات تو یہ کہ دونوں بزرگ شاعر جدید نظم سے بالکل بے تعلق تھے اور پابند نظم کی روایت میں اپنا شاندار مقام رکھتے تھے۔انہوں نے اُس زمانے میں جب یہ تیرہ چودہ برس کے تھے، کیسے یہ گمان کر لیا کہ یہ نوجوان نظم کا مزاج رکھتا ہے۔ایسی کم عمری میں اگر کوئی بات قرینِ قیاس ہو سکتی ہے تو اتنی کہ ستیہ پال آنند نے لڑکپن میں شاعری کے نام پر تک بندی جیسے چند مصرعے لکھے ہوں گے اور ان بزرگوں کو دکھائے ہونگے۔پرانی روایات کے امین ان بزرگوں نے بے وزن تک

بندی دیکھ کر شاعری سے روکنے کے لیے کہا ہو گا کہ میاں! آجکل جو آزاد شاعری کی جا رہی ہے، آپ بھی ویسی نظمیں لکھا کرو۔پابند شاعری مت کیا کرو۔

دوسری بات یہ کہ بھائی صاحب! دوسروں کے بتانے پر ہی کیوں سمجھے؟ جدید نظم کا معاملہ تو خارجی سے کہیں زیادہ داخلی نوعیت کا ہے۔اپنی اہمیت جتانے کے لیے کوئی روایت گھڑنی تھی تو اس میں کوئی معقول مطابقت بھی پیدا کر لی ہوتی۔

اردو کے بعض ادبی رسائل کے کاروباری مزاج کے باعث ستیہ پال آنند کی ان رسائل میں جتنی اہمیت بنی ہوئی ہے وہ ساری سر آنکھوں پر!۔تاہم یہ حقیقت واضح ہے کہ اردو غزل کے ستیہ پال آنند سے بھرپور انتقام کے باوجود، خوشہ چینی، اکتساب، استفادہ سے ہوتے ہوئے داؤ لگے تو سرقہ تک کر گزرنا ستیہ پال آنند کی شخصیت اور ان کے مزاج کا حصہ ہے۔اپنی زندگی کی کتھا لکھ کر وہ اس کتاب کا نام بھی جوگندر پال سے اُڑائے بغیر نہ رہ سکے۔اسی طرح مہاتما بدھ کے مقابلہ میں گیان اور نروان کی خالی خولی باتیں کرنا ''مہاتما خود'' بننا ہے۔یہی ستیہ پال آنند کی ادبی شخصیت ہے اور یہی ان کی حقیقت ہے۔

آخر میں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ کئی سال پیشتر عطاء الحق قاسمی کا ایک کالم ''مہاتما خود'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔عطا کے شکریہ کے ساتھ یہ عنوان اس مضمون کے لیے اختیار کر رہا ہوں۔سچ تو یہ ہے کہ عطاء کے ممدوح کی شخصیت سے زیادہ یہ عنوان میرے ممدوح ستیہ پال آنند صاحب پر فٹ آیا ہے۔سوحق بحق دار رسید۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۱۹۔مئی ۲۰۱۴ء

مطبوعہ سہ ماہی **کولاژ** کراچی۔شمارہ نمبر ۳۔۲۰۱۴ء

حیدر قریشی۔۔شخص وعکس

مرتّب : ارشد خالد

مدیر عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدر قریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ۱۹۵۳ء ‘

درست خاندانی روایت: ۱۳؍جنوری ۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یار خاں‘ خان پور (سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: شاعری میں: غزل‘ نظم‘ ماہیا

نثر میں: افسانہ‘ خاکہ‘ انشائیہ‘ سفر نامہ‘ یادنگاری‘ تحقیق وتنقید، حالاتِ حاضرہ

....

کتب کی تفصیل:

شاعری

سلگتے خواب (غزلیں)‘ ناشر: تجدید اشاعت گھر۔ لاہور، اسلام آباد۔ مطبوعہ ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں (غزلیں‘ نظمیں اور ماہیے)‘ ناشر: تجدید اشاعت گھر لاہور، اسلام آباد۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

محبت کے پھول (ماہیے)‘ ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

دعائے دل (غزلیں‘ نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۹۷ء۔

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں‘ نظمیں‘ ماہیے** ناشر: سرور ادبی اکادمی۔ جرمنی۔ مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

درد سمندر (غزلیں‘ نظمیں اور ماہیے) یہ مجموعہ کلیات ’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘ میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر

روشنی کی بشارت (افسانے) ناشر: تجدید اشاعت گھر، اسلام آباد، لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء۔

قصے کہانیاں (افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔ **افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)‘ ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء۔

ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں) ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء۔

میں انتظار کرتا ہوں (افسانوں کا ہندی ترجمہ) ناشر: ساہتیہ بھارتی، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۸ء

میری محبتیں (خاکے)‘ ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

میری محبتیں (خاکے)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری) پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی، عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے۔

اب سال ۲۰۱۳ء میں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز، خانپور۔ مطبوعہ ۲۰۱۳ء

سُوئے حجاز (سفرنامہ۔ عمرہ کا احوال)‘ ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

سُوئے حجاز (سفرنامہ، سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)، ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی۔ مطبوعہ ۲۰۰۴ء۔

فاصلے، قربتیں (انشائیے) یہ کتاب ابھی الگ سے شائع نہیں کی، ’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘ میں شامل ہے۔

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔ میگزین سائز ۴۸۴ صفحات

ناشر: معیار پبلی کیشنز۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۵ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔

میگزین سائز ۶۱۶ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔
میگزین سائز ۶۸۰ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء
کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

....

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔عوامی اور اکانومی ایڈیشن ایک ہزار سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب   **عمرِ گریزاں**   **محبت کے پھول**
دعائے دل   **دردسمندر**   **زندگی**

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

....

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵
حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ناشر: سرورادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء
تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۱۲ء
ستیہ پال آنند کی"..بُودنی نابُودنی" (مضامین)۔ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد ۲۰۱۳ء
مضامین اور تبصرے (نئے مضامین کا مجموعہ) زیر اشاعت۔ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد۔۲۰۱۴ء
ہمارا ادبی منظر نامہ (تنقید کے چھ مجموعے ایک جلد میں) ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد ۲۰۱۴ء
اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء
اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی۔مطبوعہ ۱۹۹۹ء
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) ناشر: معیار پبلیکیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء
اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔یہ کتاب "اردو ماہیا تحقیق و تنقید" میں شامل ہے)
ماہیے کے مباحث (مضامین۔یہ کتاب "اردو ماہیا تحقیق و تنقید" میں شامل ہے)
اردو ماہیا تحقیق و تنقید (ماہیے کی تحقیق و تنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)
ناشر: الوقار پبلی کیشنز۔لاہور۔مطبوعہ ۲۰۱۰ء

....

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر (9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)
ناشر: سرورادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء
خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)۔ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔
اِدھر اُدھر سے (خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۸ء
چھوٹی سی دنیا (مشرق و مغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)
۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا
حالاتِ حاضرہ (مذکورہ چاروں کتابوں کو ایک جلد میں یکجا کر کے ای بک آن لائن کر دی گئی ہے۔۲۰۱۳ء)

....

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور، مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء
کونپل: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور۔مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء
سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)
ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء
پہلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر: مکتبہ ہم زبان کراچی۔مطبوعہ ۱۹۹۰ء

....

ادارت

ادبی رسالہ "**جدید ادب**" خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔۱۷ شمارے شائع کیے۔ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔
جرمنی سے **جدید ادب** ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔www.jadeedadab.com
اب اس لنک سے بھی جدید ادب کو حاصل کیا جا سکتا ہے: http://jadeedadab.blogspot.de/
ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔**حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ:** www.haiderqureshi.com

....

اہم ای لائبریریز

ان بلاگس میں حیدرقریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://haider-qureshi.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

اس لنک پر حیدرقریشی پر لکھی گئی، مرتب کی گئی کتب ورسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدرقریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدرقریشی کی کتابوں تک رسائی مزید آسان، دو نئے مربوط بلاگس

حیدرقریشی کی تمام کتابیں الگ الگ صورت میں: http://my27books.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام ۲۷ کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں: http://kuliat-library.blogspot.de/

”ہمارا ادبی منظر نامہ“ پر ہونے والی امکانی بحث: http://hamara-adabi-manzarnama.blogspot.de/

▪▪▪

ادبی بلاگس ان بلاگس پر حیدرقریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

”روشنی کی بشارت“، ”قصے کہانیاں“ اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

خاکوں کا مجموعہ ”میری محبتیں“: http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

یادوں کا مجموعہ ”کھٹی میٹھی یادیں“: http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

انشائیوں کا مجموعہ ”فاصلے، قربتیں“: http://inshaiya.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

دو خاص بلاگس

کلکتہ اور دھلی کا سفر، با تصویر

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدر قریشی کی البم: زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

▪▪▪

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدر قریشی : http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

جدید ادب : http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

▪▪▪

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** **مصنف**: **محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ ۱۹۹۹ء) **ناشر**: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر۳، راولپنڈی۔ پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پونہ، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب: **ڈاکٹر نذر خلیق** (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** **منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔ سال ۲۰۰۲-۲۰۰۰ء

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب: **سعید شباب** (مطبوعہ ۲۰۰۴ء) **ناشر**: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ ایمسٹرڈیم۔ ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدر قریشی نمبر۔۔۔**مدیر ومرتب**: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد (کتاب نمبر۴۔ مطبوعہ اکتوبر ۲۰۰۵)

۷۔**حیدر قریشی کی شاعری** **مرتب**: **ہرمے بھانو پرتاپ**

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ (مطبوعہ ۲۰۱۳ء)

۸۔**حیدر قریشی شخص و عکس** **مدیر و مرتب**: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد (۲۰۱۴)

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدر قریشی پر ترتیب دئیے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ "**اسباق**" پونہ شمارہ:فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر:نذیر فتح پوری

۲۔**حیدر قریشی**(بطور افسانہ نگار)مطبوعہ ماہنامہ "**شاعر**" بمبئی۔
شمارہ مئی تا دسمبر ۱۹۹۷ء۔**ہم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی "دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ/حیدر قریشی" ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز** اسلام آباد ۲۲ مئی تا ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء۔ مرتبین:اختر رضا کیکوٹی/محمد وسیم انجم

۴۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ سہ ماہی "**ادبِ عالیہ**" وہاڑی۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز:ریاض ہانس

۵۔خصوصی مطالعہ "**مہرِ امروز**" مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی ۲۰۰۴ء
(اردو دوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر:خورشید اقبال

۶۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخار امام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی (تقریباً ۵۰ صفحات میگزین سائز پر مشتمل)
شمارہ:۶،۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ "**عمرِ لاحاصل کا حاصل**"
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد (کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق و نقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد
(کتاب نمبر۱۱،مئی ۲۰۱۰ء) مدیر:ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:"عمرِ لاحاصل کا حاصل"**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل**
اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ ۲۰۱۱ء۔ مدیر و مرتب:ارشد خالد

۱۱۔**ایک گوشہ حیدر قریشی کے لیے**۔دو صفحات پر مشتمل۔ روزنامہ **پیغام** دہلی
شمارہ:۱۰ مئی ۲۰۱۴ء ایڈیٹر:مطیع الرحمٰن عزیز

....

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کا ڈاک کا پتہ: Haider Qureshi
Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim, Germany.
ٹیلی فون نمبر:0049-6190-930078 **ای میل:**haider_qureshi2000@yahoo.com

....

بحوالہ **عکاس** اسلام آباد شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء **حیدر قریشی نمبر** مدیر **ارشد خالد**
جون ۲۰۱۴ء تک تازہ ترین اضافوں کے ساتھ

خصوصی نوٹ

حیدر قریشی کے اوریجنل ورک کے حوالے سے اب تک ستائیس کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔
شاعری:چھ مجموعے۔۔۔افسانے:دو مجموعے۔۔۔۔خاکے:ایک مجموعہ
یادنگاری:ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری:ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ:ایک مجموعہ
ماہیا کی تحقیق و تنقید:پانچ کتابیں۔۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین:چھ کتابیں
حالاتِ حاضرہ:کالموں کے چار مجموعے

یہی ۲۷ کتابیں متفرق اور مختلف ایڈیشنز کی صورت میں پینتیس کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کے ذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اور ادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کو ان میں شمار نہیں کیا گیا۔

....

یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن....منزہ یاسمین**
کا اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور،پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔**حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں ڈاکٹر عبدالرب استاد**
کا پی ایچ ڈی کا مقالہ۔سال ۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ،کرناٹک،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی۔حیات و خدمات انجم آراء**
کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی،کولکاتا،انڈیا۔

۴۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات....عامر سہیل**
کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی،مانسہرہ،(ایبٹ آباد)،پاکستان

۵۔**حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ہرمے بھانوپرتاپ**
کا ایم فل کا مقالہ،سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا

۶۔**حیدر قریشی کی افسانہ نگاری راضینہ خان**
کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا

~~~~~~~~~~~~~~

بالواسطہ

۱۔**جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث....شازیہ حمیرہ**
سال ۲۰۰۹ء۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور،پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔**اردو میں ماہیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید**
سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی،ناگپور،انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ
~~~~~~~~~~~~~~